-:RULES:-

1. The book must be returned on the date stamped above.
2. A fine of Re 1/- per volume per day shall be charged for tex-tbooks and 10 P. per vol. per day for general books kept overdue.

Title — ISLAM AUR AQALIYAAT (Part-2)

Creator - Maulana Ashraf Ali Thanwi.

Publisher - Insha Press (Lahore).

Date — 1953.

Pages — 304.

Subjects -

اسلام
اور
عقلیات

(حصہ دوم)

از افاضات

حکیم الامت تھانوی رح

پرمٹ نمبر ۹۵۰ بتاریخ ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۳ء

تعداد ۵۰۰

ستمبر ۱۹۵۳ء

طبع دوم

قیمت :- چار روپے

طابع : انشا پریس لاہور

کتبہ : مختار احمد وسیر

ناشر : ایم ثناء اللہ خاں ۲۱ ریلوے روڈ

لاہور

قال الله تعالى

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝

لما دلت الآية على ذم ان فن الجدل على العلم اى الضروري منه والصريح ❊ وعلى الهدى اى الاستدلال والنظر الصحيح ❊ وعلى الكتاب المنير اى الوحي الفصيح ❊ وكان الكتاب الملقب به

حل الانتباهات مع اصله

الانتباهات المفيدة عن الاشتباهات الجديدة

الذي تلقته من حكيم الامة الذي بيده دواء كل ملقى طريح ❊ مولانا الشيخ محمد اشرف علي التهانوي صاحب المأتي الصائب والقول النجيح ❊ وحله بشرح مليح من مولانا الحكيم محمد مصطفى ارشدتلامذته صاحب القلب السليم ❊ وهذا جزء ثان منه في فن الكلام مبنيا على المدار المذكور الصحيح ❊

اهتم بطبعه واشاعته محمد ثناء الله محي عنه [illegible]

وقد بالغ السيد الاحقر محمد نجم الحسن التهانوي بالتصحيح

في الادارة الاشرفية [illegible]

من بلاد پاکستان حماه الله عن كل قبيح

فہرس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اشتباہ چہارم

متعلق قرآن منجملہ اصول اربعہ شرع

یہ ثابت ہو چکا ہے کہ شریعت کی چار اصلیں ہیں۔ کتاب اللہ
حدیث الرسول صلعم۔ اجماع الامت۔ قیاس المجتہد۔ اور مجتہد سے

جہاں دین سے بچنے کے لئے بہت سے حیلے ہیں ایک حیلہ یہ بھی ہے جس میں ہمارے تعلیم یافتہ بھائی بکثرت مبتلا ہیں کہ ہر چیز کا ثبوت قرآن سے مانگتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ قرآن میں بہت سے احکام صراحۃً نہیں ملتے لہذا ان کو دینی حکم نہیں سمجھتے اور ان میں اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہیں اور یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ مذہب اسلام کی کتاب قرآن ہے جب خدائے تعالیٰ نے اسلام کو پھیلانا چاہا تو اس کو اتارا تو یہی بیخ و بنیاد ہے مذہب کی اگر اس کے سوا اور کسی کتاب وغیرہ سے

خاص شرائط ہیں ان سب میں کچھ کچھ غلطیاں کی جا رہی ہیں۔ کتاب اللہ کے متعلق دو غلطیاں ہو رہی ہیں ایک یہ کہ احکام کو قرآن میں منحصر سمجھا جاتا

احکام مذہبی ثابت کئے جائیں تو قرآن جیسی مذہبی کتاب کا ناقص ہونا لازم آتا ہے جو عقل سلیم کے بھی خلاف ہے اور خود قرآن کے اس دعویٰ کے بھی خلاف ہے

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ   آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے

اس آیت پر ہر مسلمان کا ایمان ہے پھر نہ معلوم علماء اسلام احکام مذہبی کے ثبوت کے لئے دیگر کتابوں کو کیوں پیش کیا کرتے ہیں اور جو احکام قرآن میں نہیں ہیں ان کو مسلمانوں سے کیوں منوایا کرتے ہیں یہ تقریر اُن کی عوام کو متحیر کر دیتی ہے اور ظاہر الاجواب ہے۔ ان حضرات کو یاد رکھنا چاہئے کہ دین اسلام حسب تصریح الیوم اکملت لکم دینکم واقعی مکمل[1] ہے وقت نزول آیت مذکور اُس کی تکمیل ہو چکی تھی اور اب تک مکمل ہے اور ہمیشہ مکمل رہے گا چنانچہ علوم اسلامیہ کی تکمیل اس درجہ ہوئی ہے کہ کوئی اصل یا فرع اور کلیات اور جزئیات ایسے نہیں جس سے علماء نے بحث نہ کی ہو منجملہ ان کے علم اصول احکام بھی ہے یعنی یہ کہ دین کے احکام کس طرح ثابت کئے جاتے ہیں۔

---

[1] مگر مکمل ہونا دوسرے اصول کے لئے نافی نہیں بلکہ وہ دوسرے اصول قرآن ہی کے مکمل ہونے کی شرح ہیں چنانچہ عنقریب اس کی تقریر آتی ہے ۱۲

ہے اس غلطی کا حاصل دو ہے ایک اصول کا انکار ہے دوسری یہ کہ قرآن میں
مسائل سائنس پر منطبق ہونے کی اور مسائل سائنس پر مشتمل ہونے کی کوشش

اس سے بہت کافی و افی بحثیں کی ہیں اصولِ اربعہ مذکورہ فی المتن کے متعلق مستقل ابواب بلکہ علیحدہ علیحدہ کتابیں موجود ہیں جن میں اصول مذکورہ کی حقیقت پھران پر سوال و جواب جرح و قدح مخالفین و موافقین کے اقوال و دلائل اور وہ وہ شبہات جو ابنا رزماں کو سوجھنا تو کیا معنے سمجھ میں بھی نہیں آسکتے مع اجوبہ[ف] درج ہیں۔ تکلیف کر کے کسی عالم سے دریافت کیجئے یا کسی اسلامی کتب خانہ میں جاکر کتابوں کو دیکھئے تو ہر ہر اصل کے متعلق ایک دریائے ناپیدا کنار ملے گا اور عقل حیران ہو جائے گی۔ غرض علماء اسلام نے ثابت کیا ہے کہ شریعت کی اصلیں چار ہیں اصل معنے دلیل مطلب یہ ہے کہ ان چاروں میں سے کسی قسم کی دلیل سے شرعی حکم ثابت ہو سکتا ہے خواہ ایک قسم کی دلیل سے ہو یا ایک سے زائد سے۔ حتیٰ کہ بعض احکام چاروں قسم کی دلیلوں سے ثابت ہیں اور بعض صرف ایک قسم سے۔ یہ طریقہ اثباتِ احکام شرعی کا صحیح اور نقلاً و عقلاً حق ہے۔ اور خیال ہمارے بھائیوں کا غلط ہے اور وہ تقریر بالکل باطل ہے اسی کو حضرت مصنف مدظلہ نے انتباہ چہارم میں بیان فرمایا ہے۔ اور ہر ایک اصل کے متعلق مفصل گفتگو فرما کر تمام مغالطوں کو حل کر دیا ہے۔ اس بحث کا پورا مطالعہ کرنے کے بعد صاف نظر آجائے گا کہ تقریر مذکور محض مغالطہ ہے اور تحقیق سے اس کو کچھ علاقہ نہیں اور نہ نقلاً صحیح ہے نہ عقلاً۔

[ف] جوابات ۱۲

کی جاتی ہے پہلی غلطی کا جواب وہ نصوص ہیں جن سے بقیہ اصول کی حجیت ثابت ہوتی ہے جس کو اہل اصول نے مشرح بیان کیا ہے -

---

وہ چار اصلیں یہ ہیں - کتاب اللہ - حدیث الرسول - اجماع امت قیاس مجتہد
اصل اوّل کتاب اللہ یعنی قرآن پاک ہے اس کے متعلق ہمارے بھائی اس غلطی میں تو مبتلا نہیں کہ اس کو احکام شرعی کے لیے حجت نہ مانیں جیسا کہ تین بقیہ اصلوں کے متعلق بعض کا خیال ہے جیسا کہ آگے آتا ہے - ہاں کتاب اللہ کے متعلق دو غلطیوں میں مبتلا ہیں ایک یہ کہ احکام کو قرآن میں منحصر سمجھتے ہیں جیسا کہ ان کی تقریر مندرجہ شروع باب ہذا میں صاف صاف موجود ہے - دوسری غلطی یہ کہ کوشش کرتے ہیں کہ قرآنی تحقیقات کو سائنس کے مطابق کر کے دکھائیں - نیز مسائل سائنس کو قرآن سے ثابت کریں - یہ بات ظاہراً بہت خوش کن ہے مگر بے اصل اور نہایت مضر اور غلط ہے جیسا کہ عنقریب معلوم ہوتا ہے -

پہلی غلطی کا حاصل یہ ہے کہ جب احکام قرآن میں منحصر ہیں تو بقیہ اور یہ تین قسم کے دلائل بیکار ہیں یعنی ان سے کوئی حکم شرعی نہیں ثابت کرنا چاہیئے اور جو حکم ان سے ثابت کیا جائے گا غیر قابلِ تسلیم ہوگا - اس خیال کا غلط ہونا ان نصوص سے ثابت ہوتا ہے جن میں صاف موجود ہے کہ بقیہ تین قسم کے اصول بھی بیکار نہیں بلکہ ان سے بھی احکام شرعی ثابت ہوتے ہیں نصوص دو قسم کے ہیں احادیث اور آیات قرآنی - مثلاً حدیث میں ہے :-

قَالَ[1] رسول الله صلی الله علیه وسلم ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بهما کتاب الله وسنة رسوله صلی الله علیه وسلم

فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں تم ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ جب تک ان دونوں کو دلیل بناؤگے کتاب اللہ اور سنت رسول یعنی حدیث

اس سے صاف ثابت ہے کہ حدیث بھی قابل احتجاج چیز ہے نہ جیسا کہ اہل زمان کہتے ہیں۔ دوسری[2] حدیث میں ہے

الا[2] هل عسی رجل یبلغه الحدیث عنی وهو متکئ علی اریکته فیقول بیننا وبینکم کتاب الله فما وجدنا فیه حلالا استحللناه وما وجدنا فیه حراما حرمناه وان ما حرم رسول الله کما حرم الله ولا لیبے داؤد الا انی اوتیت الکتاب ومثله معه

سن لو کیا ایسا ممکن ہے کہ کوئی شخص ہے کہ اس کو مجھ سے کوئی حدیث پہنچے اور وہ اپنی مسند پر تکیہ لگائے بیٹھا رہے (یعنی حدیث کی طرف سے لاپروائی کرے) پس کہے کہ ہمارے تمہارے درمیان کتاب اللہ موجود ہے تو جس چیز کو ہم اس میں حلال پائیں گے اس کو حلال سمجھیں گے اور جس چیز کو

---

۱ از جمع الفوائد کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة ۱۲

۲ از جمع الفوائد کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة ۱۲

اس میں حرام پائیں گے اس کو حرام سمجھیں گے۔
(یعنی کتاب اللہ کافی ہے حدیث کی ضرورت
نہیں) حالانکہ جس چیز کو اللہ کا رسول حرام
کرے وہ ایسا ہی ہے جیسے اللہ نے حرام
کیا۔ اور ابو داؤد کی روایت میں یہ لفظ ہیں کہ
سن لو کہ مجھ کو کتاب (یعنی قرآن) دی گئی ہے
اور اسی جیسی ایک چیز اس کے ساتھ (یعنی حدیث)

یہ حدیث کس قدر صاف ہے حدیث کے حجت ہونے اور انہار زمان کے خیال کی تغلیط میں۔ اور[۱] ایک حدیث میں ہے:-

من یعش منکم بعدی فسیریٰ	یعنی فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
اختلافا کثیراً فعلیکم	نے کہ جو کوئی زندہ رہے گا بعد میرے تو
بسنتی و سنۃ الخلفاء	دیکھے گا بہت اختلاف تو لازم پکڑ لینا
الراشدین المھدیین۔	تم میری سنت کو اور خلفاء راشدین کی سنت کو

اس حدیث سے حدیث رسول کے ساتھ حدیث صحابی کا حجت ہونا بھی ثابت ہوا بوجہ خوف طوالت ہم احادیث میں سے صرف ان ہی چند احادیث پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ احادیث اس مضمون کی بہت ہیں اور آیات قرآنی یہ ہیں:-

---

۱؎ از جمع الفوائد کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ۱۲

۱ مَآ آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ — یعنی جس بات کا تم کو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)
وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا — حکم دیں اس کو اختیار کرو اور جس بات سے منع
کریں اس سے باز رہو۔

اور ۲
مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ — یعنی جو کوئی اطاعت کرے رسول کی تو
اَطَاعَ اللّٰهَ — اس نے اطاعت کی اللہ کی

اور ۳ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ — یعنی ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ
اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ — اس کی اطاعت کی جائے خدائے تعالےٰ کے
حکم کی وجہ سے۔

یعنی اس کا حکم حق تعالےٰ کے فرمانے کی وجہ سے بجا لایا جائے۔

اور ۴ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ — یعنی قسم ہے آپ کے رب کی کہ نہیں مومن ہوں گے
حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ — یہ لوگ تا وقتیکہ آپ کو پنے آپس کے اختلافات
بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ — میں حکم نہ قرار دیں پھر اپنے دلوں میں آپ کے
اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ — فیصلے کے متعلق کچھ تنگی نہ پائیں اور اس کو
وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا — پورے طور سے مان لیں۔

اس قسم کی آیتیں قرآن شریف میں بہت ہیں بطور نمونہ چار آیتیں یہاں لکھی گئیں۔
ان سے کس وضاحت کے ساتھ حدیث کا واجب العمل ہونا ثابت ہوتا

ہے۔ اور اجماع کے بارہ میں یہ آیت ہے:۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ	یعنی جو کوئی مخالفت کرے گا رسول کی اس کے
بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى	بعد کہ اس پر طریق ہدایت واضح ہو چکا اور
وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ	پیروی کرے گا طریق مومنین کے سوا دوسرے
الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى	طریق کی تو ہم اس کو جو کچھ[1] وہ کرتا ہے کرنے دیں گے
وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ	اور داخل کریں گے اس کو دوزخ میں۔

سبیل المؤمنین سے مراد وہی طریقہ ہے جس کو مومنین اختیار کریں اسی کا ترجمہ اجماع ہے۔ ثابت ہوا کہ اجماع کی مخالفت جائز نہیں اور اجماع حجت ہے اس کی تفصیل کتاب میں آگے آتی ہے اور قیاس کا ثبوت ان آیات سے ہے اول قیاس کی حقیقت سمجھ لینا ضروری ہے ہمارے بھائی اس کے متعلق غلطی میں مبتلا ہیں کیونکہ قیاس کا ترجمہ اٹکل یا خیال یا گمان سمجھتے ہیں اسی بنا پر اٹکل سے دین کے مسائل گھڑ کر عمل کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں جیسے متقدمین قیاس سے مسائل بناتے تھے ہم بھی کیوں نہ بنائیں جاننا چاہیئے کہ قیاس علماء کی اصطلاح میں ایک نہایت معقول طریقہ استدلال کا ہے جس کا معقول ہونا نقلاً و عقلاً و عرفاً ہر طرح مسلم ہے حقیقت اس کی یہ ہے کہ ایک چیز کا صریح حکم پا کر دوسری ایسی چیز کے لئے بھی وہ حکم ثابت مان لیں جس کے لئے صریح حکم موجود نہ ہو لیکن

---

[1] کذا فی البیضاوی ۱۲

وہ اس چیز کے مشابہ ہو جس کا حکم صریح موجود ہے یہ ماہیت ہے قیاس کی۔ اس کے کئی جزو ہیں اوّل وہ چیز جس کا حکم صراحتاً موجود ہو۔ دوسرا جزو وہ چیز جس کا حکم صراحتاً موجود نہ ہو اول کو مقیس علیہ اور دوم کو مقیس کہتے ہیں۔ تیسرا جزو وہ بات ہے جس میں دونوں یعنی مقیس علیہ اور مقیس مشابہت رکھتے ہیں۔ اس کو وجہ شبہ یا علت کہتے ہیں۔ سمجھ میں آگیا ہوگا کہ قیاس ایک باضابطہ طریقہ استدلال ہے اور اس کے لئے یہ شرط ہے کہ وہاں کام لیا جائے جہاں حکم صریح موجود نہ ہو ہم اس کا ثبوت آیات و احادیث سے اور عرف و عقل سے دیتے ہیں۔ آیات یہ ہیں۔ وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ اس آیت میں حق تعالٰے نے بعض لوگوں کی شکایت کی ہے اور اصلاح فرمائی ہے۔ ترجمہ یہ ہے کہ جب آتی ہے ان کے پاس کوئی خبر امن کی یا خوف کی تو چرچا کر دیتے ہیں اس کا۔ کاش وہ اس خبر کو رسولؐ کے پاس اور ارباب حل و عقد کے حوالہ کرتے تو وہ لوگ جو استنباط کی قوت رکھتے ہیں اس کو سمجھ لیتے یعنی شریعت کے موافق اس کا چرچا کرنے نہ کرنے کا موقع معلوم کر کے کام کرتے۔ استنباط کا ترجمہ استخراج ہے یعنی حکم کا نکالنا۔ آیت میں دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہوا ہے ایک وہ جنھوں نے خبر کا چرچا کیا جس پر حق تعالٰے نے نکیر فرمائی۔ دوسرے وہ جن کی طرف خبر لے جانے کا گروہ اول کو حکم دیا اور ان کو صاحب

استنباط فرمایا دونوں میں فرق ہے تو صرف یہ کہ اولیٰ صاحب استنباط نہیں
اور دوسرے صاحب استنباط ہیں اگر اس کا حکم شریعت میں صاف صاف
موجود ہوتا تو دونوں کو معلوم ہوتا پھر استنباط کی ضرورت کیا ہوتی معلوم ہوا کہ بعض
امور ایسے بھی ہیں جن کا حکم شریعت میں صاف صاف موجود نہیں ہے جن میں
استنباط کی ضرورت ہے اور غیر صاحب استنباط کو صاحب استنباط کی طرف
رجوع کرنے کا حکم ہے۔ اسی کو علماء قیاس کہتے ہیں جس سے منصوص سے
غیر منصوص کا حکم نکالا جاتا ہے۔ آیت دیگر جس سے قیاس کا ثبوت ہوتا ہے۔

فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ یعنی عبرت پکڑو اے اصحاب بصیرت

اس مضمون کی آیتیں بکثرت ہیں جو امم سابقہ کے قصے بیان کرنے کے بعد آئی
ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ پہلی امتوں پر فلاں فلاں طرح کے عذاب آئے تم
اس سے عبرت پکڑو عبرت کی حقیقت کیا ہے یہی کہ ان لوگوں نے ایک نافرمانی
کی اس پر عذاب آیا وہ نافرمانی علت ہے عذاب کی اس کا خیال رکھو کہ وہ
علت یعنی نافرمانی تم میں نہ پائی جاوے تاکہ وہ اثر جو نافرمانی سے ان پر ہوا
تھا تم پر بھی نہ ہو جاوے اسی کو قیاس کہتے ہیں امم سابقہ مقیس علیہ ہیں اور
موجودین مقیس اور نافرمانی علت حکم یا وجہ شبہ۔ قیاس کے ثبوت کے لئے
اس قدر آیات موجود ہیں کہ صرف ترجمہ قرآن کا بھی پڑھا جاوے تو سمجھدار آدمی
ان آیتوں کو نکال سکتا ہے لہذا ہم دو ہی آیتوں پر اکتفا کرتے ہیں اور قیاس کے

حجت ہونے کے بارہ میں احادیث اس کثرت سے موجود ہیں کہ ان کے لکھنے کے لئے ایک دفتر چاہیے لہذا ہم صرف ایک حدیث پر اکتفا کرتے ہیں جو اس مضمون میں بہت ہی واضح ہے وہ حدیث[۱] یہ ہے :-

عن معاذ ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لما بعثه الى اليمن قال كيف تصنع ان عرض لك قضاء قال اقضي بما في كتاب الله قال فان لم يكن في كتاب الله قال فبسنة رسول الله صلى الله عليه وسلم قال فان لم يكن في سنة رسول الله قال اجتهد برأيي ولا آلو قال فضرب رسول الله صلى الله عليه وسلم صدري ثم قال الحمد لله الذي وفق رسول رسول الله لما يرضي رسول الله

روایت ہے معاذ ابن جبل رضؓ سے کہ جب بھیجا اُن کو جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے والی یمن بنا کر فرمایا کیا کرو گے تم اگر پیش آئی کوئی فیصلہ کی بات عرض کیا میں فیصلہ کروں گا کتاب اللہ کے موافق فرمایا اگر نہ ہو وہ حکم کتاب اللہ میں عرض کیا اس صورت میں حضورؐ کی سنت یعنی حدیث کے موافق کروں گا۔ فرمایا اگر نہ ہو وہ حکم حدیث میں عرض کیا اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور میں اس میں کوتاہی نہیں کروں گا یعنی بہت غور و خوض سے کام لوں گا معاذ بن جبل رضؓ کہتے ہیں کہ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک میرے سینہ پر مارا پھر فرمایا شکر ہے اللہ کا جس نے توفیق دی اپنے رسولؐ کے نائب کو اس بات کی جس کو اس کا رسول [illegible]

---

[۱] از کتاب اعلام الموقعین لابن القیم جلد اول بحث الاجتہاد ۱۲

یہ حدیث کس قدر صاف ہے اجتہاد کے حجت ہونے اور محمود اور ضروری ہونے میں۔
نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تمام احکام کتاب اللہ میں نہیں ہیں بلکہ
تمام احکام حدیث میں بھی نہیں ہیں نہ جیسا کہ ہمارے بھائیوں کی تقریر میں ہے
رہا یہ کہ اس سے ناقص ہونا کتاب اللہ کا لازم آتا ہے حالانکہ وہ مکمل ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ناقص ہونا کتاب
اللہ کا جب لازم آتا ہے کہ دعوے کیا جاوے کہ کتاب اللہ میں بلا واسطہ تمام احکام موجود ہیں یہ دعوے
کہیں نہیں کیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ بہت سے احکام کتاب اللہ میں موجود ہیں اور بہت سے حدیث میں
موجود ہیں اور بہت سے قیاس سے ثابت ہیں لیکن جبکہ کتاب اللہ میں حدیث
کے واجب العمل ہونے کا ثبوت موجود ہے اور کتاب اللہ اور حدیث دونوں
میں قیاس کے حجت ہونے کا ذکر موجود ہے تو جو احکام حدیث و قیاس سے ثابت
ہوں وہ بھی کتاب اللہ ہی سے ثابت ہوئے کیا نہیں دیکھتے کہ قانون شاہی
پارلیمنٹ میں بنائے جاتے ہیں اس میں بہت سے اختیارات وائسرائے
کو دیئے جاتے ہیں علی ہذا وائسرائے کی کونسل میں ان اختیارات کی بموجب
قانون بنائے جاتے ہیں۔ ان میں بھی بعض اختیارات گورنروں کو دیئے جاتے
ہیں پھر ان اختیارات کے بموجب گورنروں کی کونسل میں قانون بنائے جاتے
ہیں اور بعض اختیارات لوکل گورنمنٹوں کو دیئے جاتے ہیں یہاں تک کہ یہی
سلسلہ ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپل بورڈوں تک پہنچتا ہے اور ہر درجہ
میں بعض احکامات ایسے ہوتے ہیں جو اس سے اوپر کے درجے میں نہیں ہوتے

لیکن نیچے سے نیچے درجہ کا حکم بھی گورنمنٹ کا حکم مانا جاتا ہے اور اس کی مخالفت گورنمنٹ کی مخالفت کہی جاتی ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ میونسپلٹی تک کے نیچے درجہ والوں کے احکام پارلیمنٹ کے قانون میں موجود ہیں بلکہ وجہ یہ ہے کہ پارلیمنٹ نے اپنے احکام کے ساتھ وائسرائے کے احکام کو تسلیم کیا اور اسی طرح ہر اوپر کے درجہ والے کے احکام کو تسلیم کیا تو سب کا سلسلہ پارلیمنٹ تک مل گیا تو سب احکام پارلیمنٹ یا گورنمنٹ کے احکام کہے جانے لگے دیکھئے میونسپلٹی تک کے کاغذات پر لکھا جاتا ہے (سرکار قیصر ہند) کیا قیصر ہند میونسپلٹی کے چیئرمین کا مخاطب ہے یا مجسٹریٹ ضلع کا مخاطب ہے جب کہ میونسپلٹی کا سلسلہ متعدد واسطوں سے قیصر ہند تک ملا ہوا ہونے کی بناء میونسپلٹی کے احکام قیصر ہند کے احکامات کہلائے جا سکتے ہیں تو قیاس اور حدیث کا سلسلہ تو کتاب اللہ سے صرف ایک دو واسطہ سے ملا ہوا ہے تو ان کے احکامات کو کتاب اللہ کے احکامات کہنے میں کیا تعجب کی گنجائش ہے بلا تردد سب کو کتاب اللہ کے احکامات کہہ سکتے ہیں علماء اسلام نے ان سب احکام کو جمع کر دیا ہے اور اس کا نام علم فقہ رکھا ہے اب ہمارا دعویٰ ہے کہ علم فقہ ایسا مکمل علم ہے جس سے کوئی بھی جزئی نہیں چھوٹی تجربہ کر لیجئے کہ کوئی مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ صورت پیش آئے اس کو علماء کے سامنے پیش کیجئے اس کا جواب مدلل ملے گا۔ اور ہم کہتے ہیں کہ اسی صورت کو دیگر مذاہب کے علماء کے سامنے پیش کیجئے اول تو جواب ہی نہ ملے گا اور اگر ملا بھی تو وہ اپنی مذہبی کتاب سے بلا واسطہ

یا بواسطہ ہرگز ثابت نہیں کر سکیں گے اس سے تصدیق ہوتی ہے کہ وعدہ

الیوم اکملت لکم دینکم میں آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا۔

یہ صورت ہے دین کے مکمل ہونے کی نہ یہ کہ سارے احکام جزئی و کلی قرآن ہی میں ڈھونڈے جائیں اور یہی روش ہے فطرت کی اور ہمیشہ سے یہی طریقہ دنیا میں رائج رہا ہے کہ شاہی احکامات صرف وہی نہیں ہوتے جو خاص بادشاہ کی زبان سے نکلیں بلکہ بادشاہ کے نائب اور نائب کے نائب جہاں تک بھی سلسلہ پہنچے سب کے احکامات شاہی احکامات کہلاتے ہیں یہ کس قدر موٹی بات ہے مگر افسوس ہے کہ دنیا کی باتوں میں اسکو مانا جاتا ہے اور دین کی باتوں میں اسپر اشکال کیئے جاتے ہیں اس نظیر سے قیاس کا عقل و شرع کے مطابق ہونا بہت واضح ہوگیا اصول دین کے متعلق پہلی غلطی یہ بیان ہوئی ہے کہ احکام کو قرآن میں منحصر سمجھا جاتا ہے اس کا رد بہت کافی ہوچکا خلاصہ اس کا یہ ہے کہ خود قرآن ہی اس خیال کو غلط کہتا ہے اور قرآن ہی حدیث کے حجت ہونے کو اور اجماع اور قیاس کے حجت ہونے کو ثابت کرتا ہے تو اگر قرآن کو ماننا ہے تو حدیث اور اجماع اور قیاس کو بھی ماننا پڑے گا (حدیث اور اجماع اور قیاس کی بحثیں فرداً فرداً آگے آتی ہیں) اسی پہلی غلطی یعنی احکام کو قرآن میں منحصر ماننے کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ اپنی خواہشات پورا کرنے کا بہت کچھ موقع ملتا ہے اس طرح کہ جس خواہش کو پورا کرنے کو جی چاہا اور دین کا خیال بھی کچھ دل میں آیا تو قرآن اٹھا کر دیکھ لیا اور اس میں اس فعل

اور اسی غلطی کی ایک فرع یہ ہے کہ جس گناہ کے کرنے کو جی چاہتا ہے اس سے منع کئے جانے کے وقت یہ سوال کر دیا جاتا ہے کہ قرآن میں ممانعت دکھلاؤ۔ چنانچہ داڑھی کے متعلق ایسے سوالات اخباروں میں شائع ہوتے ہیں

کی ممانعت نہ ملی تو اسی کو بیڈھرک پورا کر ڈالا اس کے متعلق ایسا شرح صدر ہوگیا کہ اس کے بارہ میں رسالہ یا مضمون لکھ ڈالا حتیٰ کہ علماء سے بھی مباحثہ اور مناظرہ کرنے کو تیار ہو گئے اب جو کوئی ان کو روک ٹوک کرتا ہے تو اس سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کی ممانعت قرآن میں دکھاؤ جیسے ڈاڑھی منڈانے کے متعلق اخباروں اور رسالوں میں مضامین نکلتے ہیں اور زبانوں پر بھی آتے ہیں کہ ڈاڑھی رکھنے کا حکم اور منڈانے کی ممانعت کہیں قرآن میں نہیں یہ صرف علما کی زبردستی اور اختراع ہے اس مذاق کا غلبہ طبیعتوں پر اس درجہ ہوا ہے کہ مناظروں اور مباحثوں میں بھی ہر بات کو قرآن ہی سے ثابت کرنا چاہتے ہیں حتیٰ کہ مخالفین مذہب کو بھی یہ طرزِ عمل معلوم ہو گیا ہے لہٰذا وہ بھی ہر بات کا ثبوت قرآن ہی سے مانگتے ہیں اور انہوں نے مخالفین کے اس مطالبہ کو پورا کر کے اسی کا خوگر بنا دیا ہے اب بعض وقت یہ ہوتا ہے کہ مخالفین کسی مسئلہ کا ثبوت قرآن سے مانگتے ہیں تو ہمارے بھائی حسب عادت قرآن سے اس کو تلاش کرتے ہیں اگر خود اس میں کامیاب نہیں ہوتے تو علماء سے امداد چاہتے ہیں اور یہی اصرار ہوتا ہے کہ جس طرح ہو سکے قرآن ہی سے اس کو ثابت کر دو تاکہ مخالف کا منہ

پھر یہ امر ایسا خمیر میں داخل ہو گیا ہے جب کوئی مخالف مذہب کسی بات
کو قرآن سے ثابت کرنے کا مطالبہ کرتا ہے تو یہ لوگ اس مطالبہ کو صحیح
اور اس بات کو اپنے ذمہ لازم سمجھ کر اس کی تلاش میں لگ جاتے ہیں اور

بند ہو جاتے چنانچہ بعض وقت علما بمصلحت وقت ایسا کہہ بھی دیتے ہیں ہمارے
بھائی اس کو بڑا تبحر سمجھتے ہیں اور اسی کو اہلِ اسلام کی جیت کہتے ہیں اور اگر کوئی
عالم ایسا نہ کر سکے یا قصداً نہ کرے اس بنا پر کہ یہ بے اصول چال ہے تو اس کو
غیر متبحر کہتے ہیں اور مناظرہ میں اس کو ہار سمجھتے ہیں خوب سمجھ لینا چاہئے کہ بے قاعدہ
چال بے قاعدہ ہی ہوتی ہے کہیں چل جاتی ہے اور اکثر بیکار بلکہ مضر ثابت ہوتی
ہے ابھی اوپر اسی انتباہ چہارم میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ
جملہ احکام قرآن سے براہ راست ثابت ہو سکتے ہیں بلکہ صحیح یہ ہے کہ اصول
شرعی جن سے احکام شرعی ثابت کئے جاتے ہیں چار ہیں - قرآن، حدیث، اجماع
قیاس اور ان سب کے ثبوت قرآن ہی سے دئے گئے اور اس کے متعلق
ہر قسم کی بحث گذر چکی غرض بخوبی ثابت کیا جا چکا کہ صرف قرآن پر مدار احکام سمجھنا
غلط ہے جب یہ غلط ہے تو جو باتیں اس پر مبنی ہوں وہ بھی سب غلط ہوں گی
اسی کو بناء فاسد علی الفاسد کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جس بات کی بناء غلط
بات پر ہو وہ خود بھی غلط ہی ہوتی ہے جبکہ اس کی بناء کا غلط ہونا ثابت کیا جا چکا
تو اس کے غلط ہونے کے متعلق بیان کو طول دینا فضول ہے اسی واسطے

جو خود اس پر قادر نہیں ہوتے تو علماء کو مجبور کرتے ہیں کہ کہیں قرآن ہی سے
ثابت کرو۔ سو جب اس فرع کی بنا ہی کا غلط ہونا ثابت ہو چکا ہے تو اس فرع
کا بناء الفاسد علی الفاسد ہونا بھی ظاہر ہو گیا مستقل رد کی ضرورت نہیں

حضرت مصنف مدظلہ فرماتے ہیں کہ اس کے لئے مستقل رد کی ضرورت
نہیں اور یہ بالکل ظاہر ہے باقاعدہ اور سیدھی چال یہی ہے کہ جب قرآن
نے چاروں اصول کو تسلیم کیا ہے تو جو حکم جس سے ثابت ہونے کے قابل ہے
اُس کو اسی سے ثابت کیا جائے اور ان میں سے کسی ایک سے بھی جو حکم
ثابت ہو وہ واجب التعمیل ہوگا ہاں فرق مراتب ضرور ہوگا جس کو علماء نے ہر جگہ
ملحوظ رکھا ہے جس کے لئے فقہ تمام و کمال مدون ہے سیدھی چال چھوڑ کر الٹی
چال اختیار کرنے میں صدہا خرابیاں ہو سکتی ہیں جیسا کہ حضرت مصنف مدظلہ فرماتے
ہیں کہ اس دروازہ کا کھولنا نہایت ہی بے احتیاطی ہے۔ اس سے نہ صرف
معمولی مسائل شرعیہ کو زک پہنچے گی بلکہ بڑے بڑے مسائل کو بھی جن کو ارکانِ اسلام
کہا جاتا ہے زک پہنچے گی ہر مسلمان جانتا ہے کہ ارکانِ اسلام چار ہیں۔ نماز،
زکوٰۃ، روزہ، حج ان میں سے کسی کے بھی تمام مسائل قرآن سے ثابت
نہیں کئے جا سکتے نہ نماز کی تعداد رکعات کوئی قرآن سے ثابت کر سکتا ہے
نہ اوقات نہ فرائض نہ شرائط بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ حدیث و آثار سلف سے قطع
نظر کر کے کوئی صرف قرآن کو سامنے رکھ کر ایک رکعت بھی نماز کی نہیں ادا کر سکتا

پھر اس دروازہ کا مفتوح کرنا نہایت ہی بے احتیاطی ہے اس کا انجام خود ارکانِ اسلام کا غیر ثابت بالشرع ماننا ہوگا کیا کوئی شخص نمازِ پنج گانہ کی رکعات کا عدد قرآن سے ثابت کر سکتا ہے۔ کیا کوئی شخص زکوٰۃ کا نصاب

علیٰ ہذا زکوٰۃ کے لئے مقدار نصاب اور یہ کہ کتنے مال میں کتنی زکوٰۃ واجب ہے اور شرائط وغیرہ اور روزہ کے سب احکام بھی صرف قرآن ہی سے ثابت نہیں ہو سکتے اور حج کے اعمال تو اس قدر پیچیدہ ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی۔

وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا ہم کو افعالِ حج کی آپ ہی تعلیم کیجئے۔

یہ افعال سب کے سب قرآن میں کہاں مذکور ہیں انہی کی تعلیم کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس سب کے ساتھ حج کیا۔ غرض صرف قرآن کے ذریعہ سے کوئی بھی عمل دین کا ادا نہیں ہو سکتا ہم نہیں کہہ سکتے کہ جب یہ حالت ہے تو ہر بات کے ثبوت کے لئے صرف قرآن کو طلب کرنا کس طرح درست ہے اور جب اس چال سے ارکانِ اسلام تک کو زک پہنچی تو یہ چال دین کے لئے مضر ہی ہوئی نہ کہ مفید حالانکہ اس کو اختیار کیا جاتا ہے دین کی حمایت کے لئے تو یہ اس کا مصداق ہوئی "دوستی بے خرد چوں دشمنی است حق تعالیٰ زیں چنیں خدمت غنی است" اسی کے لئے جو نظیر حضرت مصنف رح نے پیش کی ہے بہت ہی واضح ہے کہ عدالت میں مدعی کی طرف سے ثبوت

اور قدر واجب کا اثبات قرآن سے کرسکتا ہے وعلیٰ ہذا۔ ایسے مطالبہ کا
غیر معقول ہونا ایک حسی مثال سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ عدالت میں اگر کوئی شخص
اپنے دعوے کے ثبوت میں گواہ پیش کرے تو مدعا علیہ کو اس گواہ پر قانونی جرح

پیش کیا جاتا ہے ثبوت ہی کا ترجمہ دلیل ہے تو دلیل کا ایسا ہونا تو ضروری ہے
کہ اس کو دلیل کہا جاسکے یعنی گواہ ہوں اور وہ غیر مجروح ہوں اس کے متعلق فریق
ثانی جو کچھ بھی جرح قدح کرے قابلِ سماعت سمجھا جاتا ہے لیکن مدعیٰ علیہ کی طرف
سے کسی خاص گواہ کا مطالبہ صحیح نہیں سمجھا جاتا جس گواہ کو بھی مدعی پیش کرے گا۔
دعویٰ ثابت ہوجائے گا مدعیٰ علیہ کا یہ عذر قابلِ سماعت نہ ہوگا کہ فلاں شخص
گواہی میں پیش کیا جائے تب میں اس دعوے کو تسلیم کروں گا اسی طرح جبکہ
ثابت ہوچکا کہ شرعی احکام کے لئے چار قسم کی دلیلیں ہوسکتی ہیں (اس کا ثبوت
ہم قرآن سے دے آئے ہیں) تو جس حکم کے لئے ان میں سے ایک
قسم کی دلیل بھی مل جائے گی حکم شرعی ثابت ہوجائے گا کسی دوسری قسم کی دلیل
کا مطالبہ درست نہیں۔ داڑھی رکھنے کا وجوب حدیث سے ثابت ہے لہٰذا
یہ کہنے کا حق نہیں کہ قرآن سے ثابت کرو۔ یہی اصلیت ہے فن مناظرہ
کے اس اصول کی کہ مدعی سے نفس دلیل کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے کسی دلیل
خاص کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اس طرح تو کوئی دعوے ثابت ہو ہی
نہیں سکتا کیونکہ جو دلیل مدعی پیش کرے گا مدعا علیہ کہہ دے گا کہ اس دلیل کو

کا تو اختیار حاصل ہے لیکن اگر گواہ جرح میں صاف رہا تو یہ اختیار نہیں کہ
عدالت سے یہ درخواست کرے کہ گو گواہ غیر مجروح و معتبر ہے مگر
میں تو اس دعوے کو جب تسلیم کر دوں گا کہ بجائے اس گواہ کے فلاں

میں نہیں مانتا فلاں قسم کی دلیل لاؤ۔ اور یہ اصول مبنی ہے معقول کے ایک
مسئلہ پر وہ یہ ہے کہ ملزوم کی نفی مستلزم لازم کی نفی کو نہیں ہے۔ یہ جملہ کسی قدر
شرح کا محتاج ہے وہ یہ ہے کہ جو چیز دوسری چیز کے ساتھ اس طرح پائی جائے کہ
ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی ہے اور دوسری شے کا وجود بلا اس کے
نہیں ہو سکتا تو شئے اول کو لازم اور دوسری کو ملزوم کہتے ہیں اور دونوں
میں جو یہ تعلق ہے اس کو لزوم کہتے ہیں محسوسات میں اس کی مثال روشنی اور
آفتاب ہے کہ روشنی آفتاب کے ساتھ ہمیشہ پائی جاتی ہے تو روشنی کو لازم اور
آفتاب کو ملزوم کہیں گے۔ اور معقولات میں اس کی مثال دلیل اور نتیجہ ہے
مثلاً کہا جائے کہ عالم حادث ہے یہ دعوے ہے اس پر دلیل یہ ہوگی کہ اس
واسطے کہ عالم متغیر ہے اور جو چیز متغیر ہوتی ہے وہ حادث ہوتی ہے۔ یہ
دلیل ہے اس سے نتیجہ نکلا کہ عالم حادث ہے یہ وہی دعوے ہے جس کے
لئے دلیل لائی گئی اسی کو دلیل سے ثابت ہونے کے بعد نتیجہ کہتے ہیں یہ نتیجہ
دلیل کو لازم ہے اس کے اعتبار سے دلیل کو ملزوم کہیں گے اہل معقول نے دلائل
عقلیہ سے ثابت کر دیا ہے کہ لازم کی نفی سے تو ملزوم کی نفی ضرور ہو جاتی ہے

معزز عہدہ دار یا فلاں رئیس اعظم گواہی دے تو کیا عدالت ایسی درخواست کو قابلِ پذیرائی سمجھے گی اسی راز کے سبب فنِ مناظرہ کا یہ مسئلہ قرار پایا ہے کہ مدعی سے نفسِ دلیل کا مطالبہ ہو سکتا ہے کسی دلیلِ خاص کا مطالبہ نہیں ہو سکتا اور نیز تصریح کی ہے کہ دلیل کی نفی سے مدلول کی نفی لازم نہیں

لیکن یہ کچھ ضرور نہیں کہ ملزوم کی نفی سے لازم کی بھی نفی ہو جائے - دیکھئے اگر روشنی نہ ہو تو آفتاب بھی نہ ہو گا لیکن یہ ضروری نہیں کہ آفتاب نہ ہو تو روشنی بھی نہ ہو ممکن ہے کہ روشنی اور کسی چیز سے پیدا ہو مثلاً بجلی سے یا چراغ وغیرہ سے - اسی طرح نتیجہ مذکورہ چونکہ لازم ہے اس کی نفی سے ملزوم یعنی دلیل مذکور بھی رد ہو جائے گی مطلب یہ ہے کہ اگر دلیل سے یہ نتیجہ مردود ہو گیا تو دلیل بھی رد ہو جائے گی اور بیکار سمجھی جائے گی لیکن یہ ضروری نہیں کہ اگر یہ دلیل صحیح نہ ہو تو نتیجہ بھی صحیح نہ ہو ممکن ہے کہ کسی اور دلیل سے یہ نتیجہ نکل آوے ۔(یہ یاد رہے کہ کبھی لزوم دونوں طرف سے ہوتا ہے اس صورت میں کوئی ایک چیز بلا دوسری کے نہ پائی جائے گی لیکن یہ صورت ہماری بحث سے اس وقت خارج ہے) یہ حاصل ہے اس جملہ کا نفی ملزوم مستلزم نفی لازم کو نہیں جب یہ معقولی مسئلہ طے ہو گیا تو ہمارا مدعا واضح ہو گیا کہ کسی دعوے کے لئے ایک دلیل پر حصر نہیں ہو سکتا اگر مدعی کوئی دوسری صحیح دلیل پیش کر دے تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لہذا کسی شرعی مسئلہ کے لئے یہ مطالبہ کرنا کہ قرآن ہی سے

آتی کیونکہ دلیل ملزوم ہے اور مدلول لازم اور نفی ملزوم مستلزم نہیں ہے نفی لازم کو۔
پس جو شخص دعوے کرے کہ فلاں امر شرع سے ثابت ہے اس کو اختیار
ہے کہ شرع کی جس دلیل سے چاہے اس کو ثابت کر دے کسی کو اس
سے اس مطالبہ کا حق نہیں پہنچتا کہ مثلاً قرآن ہی سے ثابت کرو۔ ہاں یہ

ثابت کرو خلاف عقل اور خلاف اصول مناظرہ ہوگا اگر مدعی قرآن سے
دلیل نہ لا سکے یا قصداً قرآنی دلیل کو نہ بیان کرے تو حسب قاعدہ مذکورہ دلیل
ملزوم ہے اور مدلول یعنی نتیجہ یا دعوے لازم لہذا ملزوم (یعنی قرآنی دلیل) کی
نفی سے لازم (یعنی دعوے) کی نفی نہیں ہو جائے گی مدعی کو اختیار ہے کہ
دوسری دلیل سے اس دعوے کو ثابت کر دے ہاں وہ دلیل شرعی
ہو اور یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ دلیل شرعی چار قسم کی ہیں قرآن۔ حدیث۔
اجماع۔ قیاس تو ان میں سے جس قسم کی دلیل سے بھی اپنے دعوے کو
ثابت کر دے گا واجب التسلیم ہوگا۔ اس کی بہت واضح اور بدیہی نظیر جو ابناء
زمان کی سمجھ میں بہت ہی آسانی سے آسکتی ہے یہ ہے کہ ایک شخص سوال کرتا
ہے کہ سو آدمیوں کی تنخواہ اٹھائیس اٹھائیس (۲۸) روپیہ ہو تو کل کتنے روپیہ ہوئے مجیب
اس سوال کو اس طرح حل کرتا ہے کہ اٹھائیس (۲۸) کو سو سے ضرب دیتا ہے
اور کل میزان دو ہزار آٹھ سو بتاتا ہے۔ اس پر اگر سائل کہے کہ میں اس جواب
کو جب صحیح مانوں گا کہ اٹھائیس کو سو جگہ لکھ کر جمع کے طریقہ سے میزان دو ورنہ

مسلم ہے کہ یہ دلائل اربعہ قوت میں برابر نہیں لیکن جیسا تفاوت ان کی قوت
میں ہے ایسا ہی تفاوت ان کے مدلولات یعنی احکام کی قوت میں ہے کہ بعض
قطعی[1] الثبوت والدلالت ہیں بعض[2] ظنی الثبوت والدلالت ہیں ۔ بعض

میں نہیں مانوں گا تو سب جانتے ہیں کہ یہ مطالبہ کس قدر لغو ہے ۔ اس کی وجہ سوا اس کے کیا ہے کہ سائل دلیل خاص کا مطالبہ کرتا ہے واضح ہو گیا کہ دلیل خاص کا مطالبہ جائز نہیں مدعی کو اختیار ہے کہ جس دلیل سے چاہے اپنے دعوے کو ثابت کرے بشرطیکہ وہ دلیل صحیح ہو جیسا کہ یہاں قاعدۂ ضرب دلیل صحیح ہے ۔ اب سمجھ میں آگیا ہو گا کہ ہر بات میں یہ مطالبہ کہ قرآن سے ثابت کرو کس قدر لغو ہے ۔ غرض دلیل کے لئے قرآن کو مخصوص سمجھنا غلط ہے ۔ خود قرآن چار قسم کی دلیلوں کو ثابت کرتا ہے تو ان چاروں میں سے جس قسم کی دلیل بھی پیش کی جائے واجب التسلیم ہو گی ہاں یہ ضرور ہے کہ چاروں قسم کی دلیلیں قوت میں برابر نہیں گو اپنے اپنے درجہ میں واجب التعمیل سب ہیں ۔ بلا تشبیہ اس کی یہ نظیر ہے جیسے پارلیمنٹ کے اور وائسرائے کے اور گورنر کے اور حکام ضلع کے احکام میں فرق ہوتا ہے اسی طرح ان میں فرق ہے علماء اسلام نے اسلام کی اتنی خدمت کی ہے کہ اس کی نظیر دیگر مذاہب میں ہرگز نہیں مل سکتی علم اصول کی کتابیں اٹھا کر دیکھئے تو کوئی شعبہ دین کا ایسا نہ ملے گا جس کے ہر ہر پہلو پر بحث نہ کی ہو چنانچہ ادلہ شرعیہ کی بحث بھی ایسی

قطعی الثبوت ظنی الدلالت ہیں بعض ظنی الثبوت قطعی الدلالت ہیں۔

مفصل اور مدلل اور مکمل ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد کوئی تردد باقی نہیں رہتا اور جس کی طبیعت میں انصاف ہے اور عقل سلیم رکھتا ہے وہ بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے کہ اس سے بہتر اور زیادہ صحیح طریقہ استدلال کا ہو ہی نہیں سکتا۔ دیکھئے یہ ثابت ہو چکا کہ احکام دین چار چیزوں سے ثابت ہوتے ہیں کتاب اللہ اور حدیث اور اجماع اور قیاس سے اور اگرچہ حدیث اور اجماع اور قیاس سب اس لحاظ سے کہ قرآن سے ان کا اصول دین ہونا ثابت ہے۔ شامل قرآن ہی کہے جا سکتے ہیں جیسا کہ حکام ضلع کے احکام اس لحاظ سے کہ وہ حکام گورنمنٹ کے مقرر کردہ ہیں گورنمنٹ ہی کے احکام سمجھے جاتے ہیں لیکن پھر بھی علماء نے ان چاروں قسم کی دلیلوں میں ایک طرح کا فرق مراتب اور بھی قائم کیا ہے وہ یہ ہے کہ درجات دلیل و وجوہ دلالت کا بھی اعتبار کیا ہے۔ چونکہ ہمارے بھائیوں کو علوم دنیاوی میں انہماک کی وجہ سے علوم دینیہ سے اس قدر بعد ہو گیا ہے کہ امید نہیں کہ وجوہ دلالت کا ترجمہ اور حقیقت سمجھ سکیں اس واسطے اس لفظ کی تھوڑی شرح کرنا ضروری ہوئی وہ یہ ہے کہ ہر حکم کی قوت دو اعتبار سے ہوتی ہے ایک اس اعتبار سے کہ وہ آمر سے مامور کے پاس کس ذریعہ سے پہنچا ہے آیا وہ ذریعہ ایسا ہے جس میں کچھ شک و شبہ کی گنجائش نہیں یا اس درجہ سے دوسرے درجہ میں ہے اگر قسم اول کا ذریعہ

ہے تو اس کو قطعی الثبوت کہتے ہیں اور اگر قسم دوم کا ہے تو اس کو ظنی الثبوت
کہتے ہیں۔ اور دوسرے اس اعتبار سے کہ اس حکم کے الفاظ آیا ایسے صریح
ہیں کہ ایک ہی معنے رکھتے ہیں دوسرے معنے کو محتمل ہی نہیں یا ایسے صریح نہیں
بلکہ دوسرے معنے کو بھی محتمل ہیں۔ اول کو قطعی الدلالت کہتے ہیں اور دوسرے
کو ظنی الدلالت کہتے ہیں۔ غرض ہر حکم باعتبار مامور کے پاس تک پہنچنے (یعنی ثبوت)
کے دو قسم پر ہے قطعی الثبوت اور ظنی الثبوت اور باعتبار اپنے معنے ظاہر کرنے
(یعنے دلالت) کے بھی دو قسم پر ہے قطعی الدلالت اور ظنی الدلالت ان دونوں
اعتباروں کے ملانے سے چار قسمیں پیدا ہوتی ہیں کیونکہ ممکن ہے کہ ایک حکم
باعتبار ثبوت کے بھی قطعی ہو اور باعتبار دلالت کے بھی قطعی ہو۔ اور ۲ ممکن ہے کہ باعتبار
ثبوت کے بھی ظنی ہو اور باعتبار دلالت کے بھی ظنی ہو۔ اور ۳ ممکن ہے کہ باعتبار
ثبوت کے قطعی ہو اور باعتبار دلالت کے ظنی ہو۔ اور ۴ ممکن ہے کہ باعتبار
ثبوت کے ظنی ہو اور باعتبار دلالت کے قطعی ہو۔ احکام شرعی میں ان چاروں
قسموں کی مثالیں موجود ہیں اور علماء نے ان میں فرق مراتب کیا ہے۔ چونکہ وہ شرعی
مثالیں ایسی ہیں کہ ان کے پوری طرح سمجھنے کے لئے کچھ علم دین کی ضرورت ہے
اور اس وقت ہمارا مقصود ان کے کماحقہ سمجھنے پر موقوف بھی نہیں ہے اس لئے
ہم ان کو یہاں نہیں لکھتے تاکہ ہمارے بھائی خواہ مخواہ الجھن میں نہ
اور ہم بجائے شرعی مثالوں کے اپنے عرف سے ان چاروں قسموں

لکھتے ہیں اس سے ہمارا مقصود حاصل ہوجائے گا بلکہ یہ بھی واضح ہوجائے گا
کہ ہمارے علماء کا رویہ شرعیات میں کس قدر صحیح ہے جس کی عرف سے تائید ہوتی
ہے اور وہ کس قدر فطرت کے مطابق ہے۔ اور اس کے خلاف رویہ اختیار
کرنا نہ صرف شریعت اور علماء شریعت کی مخالفت ہے بلکہ فطرت سلیمہ کی مخالفت
بھی ہے مثلاً ایک حاکم نے کسی اہلکار کو زبانی حکم دیا کہ تم اسی وقت فلاں ملازم سے
جو اس وقت یہیں کچہری میں موجود ہے چارج لو یہ حکم قطعی الثبوت ہے کیونکہ
حاکم کی طرف اس کے منسوب ہونے میں کسی شک و شبہ قریب یا بعید
کی گنجائش نہیں اور قطعی الدلالت بھی ہے کیونکہ الفاظ ایسے صاف ہیں کہ دوسرے
کسی معنی کو محتمل نہیں ہوسکتے یہ مثال قطعی الثبوت قطعی الدلالت کی ہوئی اور فرض
کرو کہ حاکم کا یہی حکم بذریعہ تار پہنچا کہ فلاں اہلکار فلاں ملازم سے چارج لے
ظاہر ہے کہ زبانی حکم اور بذریعہ تار حکم میں ضرور کچھ فرق ہوتا ہے اس فرق کی وجہ سے
اس کو یقینی درجہ دوم کہا جاسکتا ہے اسی کا ترجمہ ظنی ہے تو یہ حکم ظنی الثبوت
ہوا لیکن الفاظ اس حکم کے بالکل صاف ہیں دوسرے کسی معنی کو محتمل نہیں لہذا
اس کو قطعی الدلالت کہا جائے گا۔ یہ مثال ظنی الثبوت قطعی الدلالت کی ہوئی
اور فرض کرو کہ اس اہلکار کو حاکم نے زبانی حکم دیا کہ تم فلاں ملازم سے دس
بجے دن کے چارج لے لینا یہ حکم قطعی الثبوت ہے جیسا کہ اوپر گزرا۔ لیکن اس
شبہ کا کہ دس بجے کی قید میں عرفاً احتمال ہے کہ یہ قید تقریبی ہے یا تحقیقی یعنی حاکم

کو مقصود یہ ہے کہ ٹھیک دس بجے چارج لیا جائے یا یہ ہے کہ کچہری کے وقت کے
اندر لے لیا جائے اور دیکھا جاتا ہے کہ ایسے احکام میں اکثر تقریبی وقت مراد
ہوتا ہے اور اگر کبھی تحقیقی وقت مراد ہوتا ہے تو تصریح کرتے ہیں کہ دیکھو دس بجے
سے دیر نہ ہو تو جبکہ تصریح نہیں کی گئی ہے تو احتمال ہے کہ تقریبی وقت مراد
ہو اور مقصود اصلی حاکم کا چارج دلانا ہو تو اگر چارج لینے میں بجائے دس
کے سوا دس بج جائیں یا اور بھی کچھ دیر ہو جائے تو اس کو عدول حکمی نہ سمجھا
جائے گا حتیٰ کہ اگرچہ حاکم کے ذہن میں یہ قید تحقیقی بھی ہو لیکن بوجہ عرف کے
اس احتمال کا یہ نتیجہ ہوگا کہ قدرے دیر ہونے پر باز پرس نہ ہوگی تو یہ حکم تعیین
وقت کے بارے میں باعتبار دلالت کے ایسا صریح نہ ہوا جیسا وہ حکم تھا
کہ ابھی چارج لو تو اس کو یقینی درجہ دوم کہا جائے گا۔ یہ مثال قطعی الثبوت ظنی الدلالت
کی ہے اور فرض کرو کہ یہی حکم حاکم کا کہ فلاں اہل کار فلاں عہدہ دار سے کل
دس بجے دن کے چارج لے لے بذریعہ تار پہنچا کہ یہ باعتبار ثبوت کے بھی
ظنی ہے کیونکہ بذریعہ تار حکم میں اور زبانی حکم میں درجہ میں کچھ فرق ہوتا ہے جیسا
اوپر عرض کیا گیا اور باعتبار دلالت کے بھی ظنی ہے جیسا کہ صورت سوم میں بیان
کیا گیا۔ تو یہ مثال ظنی الثبوت و ظنی الدلالت کی ہوئی۔ چاروں قسم کی مثالیں ہو گئیں۔

ان مثالوں سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ ہمارے عرف میں ان چاروں طریقوں کا استعمال
احکام کے بارہ میں جاری و ساری ہے اور یہ بھی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ چاروں قسم کے

لیکن یہ بھی کسی کو منصب حاصل نہیں کہ احکام ظنیہ کو نہ مانے۔ کیا کسی
ایسے حاکم کے جس کے فیصلہ کا اپیل نہیں ہو سکتا بہت سے فیصلے
محض اسی بنا پر نہیں صادر ہوتے کہ مقدمہ مرجوعہ کو کسی دفعہ میں داخل

احکام واجب التعمیل ہوتے ہیں اسی طرح علماء نے احکام شرعی کے بارہ میں
ان چاروں قسموں کا لحاظ کیا ہے تو یہ طریقہ مطابق عرف اور قابل تسلیم ہوا
احکام شرعی میں ان چاروں قسموں کی مثالیں موجود ہیں علم اصول کی کتابیں ان سے

؎ مثال قطعی الثبوت وقطعی الدلالۃ قولہ تعالے اقیموا الصلوۃ فانہ قطعی الثبوت لکونہ آیۃ
قرآنیۃ وقطعی الدلالۃ لان الصلوۃ لفظ خاص لا یحتمل معنی آخر سوی العبادۃ الخاصۃ المعروفۃ فی الشرع و
مثال ظنی الثبوت وظنی الدلالۃ حدیث رفع الیدین الذی استدل بہ الشافعی لرفع الیدین الی المنکبین فانہ
ظنی الثبوت لانہ من جنس خبر الآحاد وظنی الدلالۃ ۔ رفع الیدین الی الاذنین یشتمل رفع الیدین الی
المنکبین مع شیئ زائد فلا دلالۃ لہ دلالۃ قطعیۃ علی انتہاء الرفع الی المنکبین کما ہو مذہب ابی
حنیفۃ ومثال قطعی الثبوت ظنی الدلالۃ قولہ تعالی ثلثۃ قروء فی عدۃ المطلقۃ فانہ قطعی الثبوت
لانہ لفظ القرآن وظنی الدلالۃ لان لفظ القرء مشترک للطہر والحیض ولذا وقع الاختلاف
بین الائمۃ فقال ابو حنیفۃ معناہ ہہنا الحیض وقال الشافعی الطہر ولکل وجہۃ ۔
ومثال ظنی الثبوت قطعی الدلالۃ حدیث رفع الیدین الی الاذنین الذی استدل بہ ابو حنیفۃ ۔ فانہ
من جنس خبر الآحاد فہو ظنی فی الثبوت دون الدلالۃ لیس کحدیث رفع الیدین الی المنکبین حیث
لا یحتمل معنے سوا المنکبین فہو قطعی الدلالۃ ۔ ۱۲

قرار دیا ہے اور وہ دفعہ یقینی ہے مگر اس میں داخل ہونا ظنی ہے۔
حاصل اس کا قطعی الثبوت ظنی الدلالۃ ہونا ہے لیکن اس کے نہ ماننے

بھری ہوئی ہیں ہم ان کو یہاں لانا باعث الجھن سمجھتے ہیں ہاں تقریب الی الفہم کے لئے اس کی عرفی مثالیں پیش کر دیں اب صرف اتنا استبعاد رہ جاتا ہے کہ کیا شرعی احکام میں بھی ظنیات ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ ظنیات ضرور ہیں مگر ظنی کے معنے میں تساہل اصطلاح ہے ظن کے معنے عرف میں مطلق گمان کے ہیں جس کو عوام خیال سے بھی تعبیر کر لیتے ہیں۔ اور علماء کی اصطلاح میں ظن کے معنے گمان وخیال کے نہیں بلکہ علم کا وہ درجہ ہے جو قطعی اور یقینی کے درجہ سے کسی قدر کم ہے جیسا کہ ہم نے ابھی عرفی مثالوں میں بیان کیا اور اس کو ہم نے پہلے تعارض ادلہ کی بحث میں اسی غلط اصطلاح سے بچنے کے لئے یقینی درجۂ دوم سے تعبیر کیا ہے اور یہاں بھی ہم اس کو اسی عنوان سے تعبیر کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ اب ہم کہتے ہیں کہ شرعی دلیلوں میں بھی سب دلیلیں برابر نہیں بعض دلیلوں کو یقینی درجہ اول کہہ سکتے ہیں اور بعض کو یقینی درجہ دوم لیکن درجہ دوم میں ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ حکم واجب التعمیل نہ رہے واجب التعمیل وہ بھی ہوگا لیکن درجہ اول سے کچھ اترا ہوا اور یہ عین حکمت ہے اسی کو وضع الشیٔ فی محلہ کہتے ہیں اور اسی کا نام حفظ مراتب ہے اس کی توضیح مذکورہ بالا عرفی مثالوں سے ہو چکی اور حضرت مصنف مدظلہ نے بھی اس کی ایک مثال دی ہے۔ وہ یہ

ہے جو نتیجہ ہو سکتا ہے اس کو ہر شخص جانتا ہے۔

یہ تقریر پہلی غلطی کے متعلق تھی جو قرآن کے بارہ میں ہوتی ہے۔ دوسری غلطی یعنے قرآن میں اس کے مسائل کو سائنس پر مشتمل ہونے کی کوشش کرنا جیسا آج کل اکثر اخباروں اور پرچوں میں اس قسم کے مضامین دیکھنے میں آتے

ہے کہ ایک حاکم کے یہاں مقدمہ دائر ہوتا ہے اور وہ اس کو کسی دفعہ میں داخل کر کے اس دفعہ کی بموجب فیصلہ کر دیتا ہے۔ اور فرض کر لیا جائے کہ وہ حاکم ایسا ہے جس کے اس فیصلہ کی اپیل نہیں (یہ قید اس واسطے ہے کہ شرعی احکام اسی شان کے ہیں) تو اس حاکم کا یہ حکم مبنی ہے اس دفعہ پر تو اس دفعہ کو اس حکم کی دلیل کہیں گے یہ دلیل قطعی الثبوت ہے یعنی کچھ شبہ نہیں ہے اس بات میں کہ وہ دفعہ قانون کی ایک دفعہ ہے لیکن اس مقدمہ کو اس دفعہ میں داخل کرنا یقینی درجہ اول کا نہیں جیسا کہ ظاہر ہے تو اس صورت میں اس دلیل کو قطعی الثبوت ظنی الدلالت کہیں گے لیکن ظنی ہونے کا نتیجہ یہ نہیں ہے کہ اس پر جو حکم مبنی کیا گیا یعنی اس حاکم کا فیصلہ قابل تسلیم اور واجب التعمیل نہ ہو وہ ایسا واجب التعمیل ہے کہ اس کی مخالفت کرنے پر تمام وہی نتائج مترتب ہوں گے جو ان دلائل پر مترتب ہوتے ہیں جو قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہیں یعنی اس کی خلاف ورزی موجب سزا ہوگی یہی حکم دلائل شرعیہ ظنیہ کا ہونا چاہیئے اس مثال سے روز روشن کی طرح ظاہر ہو گیا کہ دلیل کے ظنی ہونے کا اثر

ہیں کہ جب اہل یورپ کی کوئی تحقیق متعلق سائنس کے دیکھی سنی جس طرح بن پڑا اس کو کسی آیت کا مدلول بنا دیا اور اس کو اسلام کی بڑی خیرخواہی اور قرآن کے لئے بڑی فخر کی بات اور اپنی بڑی ذکاوت سمجھتے ہیں اور اس غلطی میں بہت سے اہل علم کو بھی مبتلا دیکھا جاتا ہے۔ اور اس میں ایک غلطی تو یہی

یہ نہیں ہے کہ وہ واجب التعمیل نہ ہے خصوصاً جبکہ یہ بھی معلوم ہو چکا کہ شرعی دلائل کے ظنی ہونے کے معنے خیالی اور فرضی ہونے کے نہیں ہیں بلکہ یہ ظنی دلائل بھی یقینی ہی ہیں صرف قدرے فرق ہے جس کی وجہ سے ہم نے ان کو یقینی درجہ دوم کہا ہے۔ علماء اصول نے کس قدر صحیح رویہ اختیار کیا ہے کہ ہر جگہ دلائل یقینیہ درجہ اول و دوم میں فرق مراتب کو ملحوظ رکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ واجب التعمیل دونوں ہیں لیکن قطعی الثبوت کا منکر کافر ہے اور ظنی الثبوت کا منکر کافر نہیں بلکہ فاسق یعنی گنہگار ہے۔ غرض دلائل شرعیہ میں فرق مراتب ضرور ہے مگر اس فرق مراتب سے یہ نہیں لازم آتا کہ وہ دلیل دلیل شرعی نہ کہی جائے جب چاروں قسموں کی دلیلوں کو دلیل شرعی کہہ سکتے ہیں تو جس حکم کے متعلق ان چاروں قسموں میں سے کسی قسم کی دلیل قائم کر دی جائے گی تو سائل کو دوسری قسم کے دلیل کے مطالبہ کا حق نہ ہوگا اور وہ حکم حکم شرعی کہلائے گا ہاں جس درجہ کی دلیل ہوگی اسی درجہ کا حکم بھی ہوگا۔ یہاں تک اس غلطی کا حل ہوا کہ احکام کو قرآن میں منحصر مانا جاتا ہے۔

ہے۔ قرآن کے لئے کہ مسائل سائنس پر مشتمل ہونے کو قرآن کا کمال سمجھا اور
وجہ اس کی یہ ہوئی کہ قرآن کے اصلی موضوع پر نظر نہیں کی گئی۔
قرآن اصل میں نہ سائنس کی کتاب ہے نہ تاریخ کی نہ جغرافیہ کی۔ وہ

دوسری غلطی قرآن کے متعلق یہ ہے کہ سائنس کی تحقیقات کو قرآن میں داخل کیا جاتا ہے کبھی تو اس طرح کہ کوئی تحقیق سائنس جدید یا قدیم کی سنی اور اور قرآن کو بھی اس کے مطابق پایا تو بڑے خوش ہوتے ہیں کہ ہمارے قرآن میں سب کچھ ہے چنانچہ یہ بھی موجود ہے اور کبھی اس طرح کہ کوئی جدید تحقیق سائنس کی سنی تو تمنا ہوتی ہے کہ ہمارے قرآن سے بھی یہ ثابت ہو جائے تو کیا اچھا ہو چنانچہ علما کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ان پر اصرار کرتے ہیں کہ اس کو قرآن سے ثابت کر ہی دو۔ اگر وہ نہیں کر سکتے یا قصداً نہیں کرتے (کیونکہ یہ ایک لغو حرکت اور التزام مالایلزم ہے) تو خود ہی کوشش کرتے ہیں اور ترجموں اور کتابوں کی لوٹ پوٹ کر کے ثابت کر ہی لیتے ہیں اور اس کو بڑی ذہانت اور وسعت نظر اور قرآن و اسلام کی بڑی خدمت سمجھتے ہیں چنانچہ جب سائنس والوں کی طرف سے غل مچا کہ زمین متحرک ہے تو اس کو اس آیت سے ثابت کر دیا:

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً — تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو کہ ان کو ایک جگہ جما ہوا سمجھتے ہو
وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ — حالانکہ وہ ایسے چل رہے ہیں جیسے بادل چلتے ہیں۔

ایک کتاب ہے اصلاح ارواح کی جس طرح کتب طبیہ میں مسائل ہیں اصلاح اجسام کے پس جس طرح کسی کتاب طبی کا پارچہ بافی و کفش دوزی کی صنعت و حرفت کی تحقیق سے خالی ہونا اس کے لئے موجب نقصان نہیں بلکہ اگر غور کیا جائے تو اس تحقیق پر بلا ضرورت مشتمل ہونا خود بوجہ خلط مبحث کے ایک درجہ میں موجب نقصان ہے اور خالی ہونا کمال ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ زمین متحرک ہے کیونکہ جب پہاڑ چل رہے ہیں تو زمین بھی چل رہی ہے۔ اس میں غلطی یہ ہے کہ سیاق و سباق کو نہیں دیکھا یہ بیان قیامت کے متعلق ہے کہ قیامت کے پہلے ایسا انقلاب ہوگا کہ پہاڑ جیسی سخت چیز بھی بادلوں کی طرح اڑتے پھریں گے "تریٰ" اور "تمر" مضارع کے صیغے ہیں ان کا ترجمہ ان لوگوں نے حال کا کیا ہے یعنی اس وقت دیکھ رہے ہو اور اس وقت چل رہے ہیں حالانکہ مضارع حال و استقبال دونوں کے لئے آتا ہے بقرینہ مقام ایک زمانہ کو متعین کیا جاتا ہے آیت کے سیاق و سباق صاف بتاتے ہیں کہ یہ جملہ قیامت کے متعلق ہے تو زمانہ استقبال ہی متعین ہوا اور ترجمہ یہ ہوا کہ اس وقت دیکھو گے کہ پہاڑ چلیں گے بادلوں کی طرح اس طرح کے سینکڑوں موقع ہیں جہاں آیتوں میں تراش و خراش کر کے مسائل سائنس ثابت کئے گئے ہیں غرض نہ حقیقت کو دیکھا جاتا ہے نہ قرائن کو بس ایک طوفان بے تمیزی برپا ہے جس کا حال رسالوں اور اخباروں کے دیکھنے سے

معلوم ہو سکتا ہے ۔ اس کا اثر بہت سے اہل علم پر بھی ہے بعض پر تو بوجہ
نیم ملا ہونے کے اور بعض پر بخیال عوام کی تالیف قلب کے حالانکہ یہ طرز عمل
بجائے صحیح اور مفید ہونے کے غلط اور مضر ہے ۔ یہ ایسا ہے جیسے بعض
جاہل واعظ وعظوں میں ترغیب و ترہیب کے لئے موضوع اور غلط روایتیں
بیان کیا کرتے ہیں کہ اس سے اس وقت تو اثر اچھا ہوتا ہے لیکن اس سے
دین کی بنیاد ہی منہدم ہوتی ہے کیونکہ کبھی راز کھل جاتا ہے اور ان باتوں کا
غلط ہونا ظاہر ہو جاتا ہے تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ جس دین میں اتنی باتیں غلط
ہیں باقی باتوں کا بھی کیا اعتبار ۔ بحمد اللہ اسلام ایسا مذہب نہیں ہے جس
کے لئے غلط اور موضوع روایتوں کی ضرورت ہو صحیح روایتیں اتنی موجود ہیں
کہ ان ہی کا ختم کرنا مشکل ہے اور نہ اسلام ایسا ہے کہ اس کی تصدیق کے لئے
سائنس کے مسائل پر مشتمل ہونا یا سائنس سے تطبیق کی ضرورت ہو وہ خود سائنس
کو حقیقت کی طرف رہبری کرتا ہے ۔ بجائے اس کے کہ عوام کی تالیف قلب کے
لئے مسائل سائنس کو قرآن میں ٹھونسا جائے ان کو حقیقت حال سے کیوں
آگاہ نہ کیا جائے اور ان کو یہ کیوں نہ سمجھا دیا جائے کہ قرآن کا موضوع کیا ہے
اور وہ کس فن کی کتاب ہے جب ان کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس فن کی
کتاب ہے تو یہ بھی آسانی سے سمجھ میں آجائے گا کہ اس فن کے سوا دوسرے
فنون کو اس میں تلاش کرنا بیجا ہے اور دوسرے فنون کے مضامین اس میں

آنا باعث کمال نہیں بلکہ اس کی عزت و عظمت کے لئے موجب زوال
ہے۔ دنیا میں ہزاروں فن ہیں اور ہر فن کے متعلق کتابیں موجود ہیں ہر کتاب
کے لئے خوبی اور کمال یہی ہے کہ جس فن کی وہ کتاب ہو اس میں اسی کے متعلق
بیان ہو نہ اس فن کا کوئی مسئلہ اس سے چھوٹے نہ دوسرے فن کا اس میں شامل
ہو اگر کوئی مسئلہ اس فن کا چھوٹ گیا ہو گا تو وہ کتاب ناقص ہو گی اور اگر دوسرے فن کا کوئی مسئلہ آ
گیا ہو گا تو اس کو خلط مبحث کہا جاویگا اور یہ دونوں باتیں کتاب کے لئے عیب میں داخل ہیں اور یہ
باتیں جس مقدار میں کسی کتاب میں ہونگی اسی قدر وہ کتاب ناپسندیدہ ہوگی قرآن بھی ایک کتاب ہے اس
کا بھی کوئی موضوع ضرور ہو گا بنا بر قاعدہ مذکورہ نہ موضوع کے متعلق کوئی فروگذاشت
ہونی چاہیئے نہ غیر موضوع کی کوئی بات قرآن میں آنی چاہیئے یہی کمال قرآن کا
ہو سکتا ہے نہ یہ کہ موضوع اور غیر موضوع سب بھرے ہوئے ہوں یہ ایسی موٹی بات
ہے جس سے کوئی ادنی عقل رکھنے والا اور علم سے مناسبت رکھنے والا انکار
نہیں کر سکتا دیکھئے گھڑی سازی کی کتاب میں بکری پالنے کا بیان نہیں ہوگا۔
اور طب کی کتاب میں جوتی گانٹھنے کا بیان نہیں ہوگا اور اگر کسی نے ایسا
کیا ہو گا تو اس مصنف کو مراقی اور خبطی کہا جائے گا اور اس کتاب کی کسی کے
ذہن میں وقعت نہ ہو گی ظاہر ہے کہ قرآن مذہبی کتاب ہے لہذا اس کا
موضوع اگر ہو سکتے ہیں تو صرف مذہبی امور ہو سکتے ہیں اور مذہب کا خلاصہ
روحانی اصلاح ہے جیسے جسمانی اصلاح کے لئے علم طب کی کتابیں ہیں

ایسے ہی روحانی اصلاح ہے تو سوا ان باتوں کے جن کو روحانی اصلاح سے تعلق ہے اور کسی بات کو اس میں تلاش کرنا اور اس کو اس کا کمال سمجھنا سوائے حماقت کے اور کیا ہوگا ہاں روحانی اصلاح اس میں مکمل ہوگی خواہ جزئیاً خواہ کلیاً جس کی جزئیات کی تفصیل دوسری حجج شرعیہ سے ہو جائے گی۔ صحیح طریقہ یہی ہے اس کے سوا دوسرا طریق اختیار کرنا خواہ کسی کی تالیف قلب کے لئے ہو یا بوجہ کم علمی کے ہو غلطی ہے جس میں صدہا خطرات ہیں اور اس کو وہی شخص اختیار کر سکتا اور پسند کر سکتا ہے جس کو اصل موضوع کا علم نہ ہو۔ تو اگر عوام یہ سوال کریں کہ فلاں سائنس کے مسئلہ کو قرآن سے ثابت کر دیجئے تو علماء کو چاہیئے کہ اس کی کوشش نہ کریں اور صاف کہہ دیں کہ یہ مسئلہ قرآن کے متعلق نہیں ہے کیونکہ قرآن کا موضوع روحانی اصلاح ہے اس سے اس کو کچھ تعلق نہیں ان جواب سے نہ ان کے تبحر اور علم میں کچھ منقصت[1] ہوتی ہے نہ قرآن کے کمال کو دھبہ لگتا ہے جیسا کہ ثابت ہو چکا۔ اور جاہلوں کی خاطر سے جہالت کا کام کرنا تکلف گنوار بننا ہے۔

یہاں یہ بات بھی سمجھنے کے قابل ہے کہ یہ جو کہا گیا کہ ہر فن کا ایک موضوع ہوتا ہے اسی کا بیان اس فن میں ہوتا ہے اور اس کے سوا دوسرا بیان آنا خلط مبحث اور داخل عیب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بالقصد بیان صرف موضوع کا ہونا چاہیئے اور بضرورت اثبات کسی مسئلہ مقصودہ کے دیگر

---

[1] کمی ۔ ۱۲

اسی طرح قرآن کا کہ طب روحانی ہے ان مسائل سے خالی ہونا اس کے لئے کچھ موجب نقصان نہیں بلکہ ایک گونہ کمال ہے۔ البتہ اس طب

کسی چیز کا بیان بھی آسکتا ہے۔ اس سے کوئی فن خالی نہیں اور یہ کتاب کے لئے داخل عیب نہیں بلکہ اس کے مضامین کے لئے مکمل[۱] اور متمم ہوتا ہے دیکھئے طب کی کتاب میں جوتیوں کا بیان اس طرح آسکتا ہے کہ اگر کسی کے پیر میں جوتا کاٹ لے تو کیا علاج ہے اس کے ضمن میں یہ بھی لکھا جا سکتا ہے کہ فلاں قسم کا جوتا زیادہ سخت اور کاٹنے والا ہوتا ہے یا ایسے ترکیبی سے گانٹھا گیا ہو تو وہ پیر کو تکلیف دے گا لہذا جوتے کو اس طرح گانٹھنا چاہیئے۔ لیکن اس کے لئے دو شرطیں ہیں ایک یہ کہ غیر موضوع کا بیان موضوع کے درجہ تک نہ پہنچ جائے یعنی حسب قاعدہ مسلم الضروری یتقدر بقدر الضرورۃ جس کا مطلب یہ ہے کہ ضروری چیز ضرورت ہی کی حد تک رہنی چاہیئے جتنے بیان کو موضوع کی تکمیل و تتمیم میں دخل ہو اسی پر بس کیا جائے۔ دوسری شرط یہ کہ جس قدر بیان غیر موضوع کا ہو وہ صحیح ہو غلط نہ ہو یعنی دوسرے فن کے جاننے والے اس کو غلط نہ کہہ سکیں۔ ضرورت ہے کہ ان دونوں شرطوں کو کسی قدر شرح کے ساتھ بیان کیا جاوے کیونکہ ہمارا مدعا اس پر موقوف ہے جو آگے آتا ہے۔ وہ شرح اس طرح ہے کہ مثال مذکور میں فرض کیا جائے کہ جوتے کے بیان میں کسی طبی کتاب کے مصنف نے جوتے کا نام آنے کی مناسبت

---

[۱] یعنی تکمیل کرنے والا اور پورا کرنے والا ۱۲

روحانی کی ضرورت سے اگر کوئی جزو اس کا مذکور ہو جاوے تو وہ
اس ضرورت کا مکمل ہے مگر بقاعدہ الضروری یتقدر بقدر الضرورۃ
مقدار ضرورت سے زائد مذکور نہ ہوگا چنانچہ توحید کے ذکر اعظم مقدمات

سے تمام جوتوں کے کارخانوں کے نام اور جوتوں کے فوٹو اور کارخانہ داروں کے نام اور پتے اور قیمتیں لکھ ڈالیں اور جزو[۱] کے جزو اس سے بھر دیئے تو کہا جائے گا کہ یہ بیان ضرورت سے بڑھ گیا اور خروج[۲] عن الموضوع ہو گیا اور اس کی وجہ سے وہ کتاب طبی کتاب نہیں رہی بلکہ جوتوں کی فہرست ہو گئی۔ یا جوتے کے گانٹھنے کی جو ترکیب لکھی وہ ایسی کہ اس طرح گانٹھا ہی نہیں جاتا مثلاً لکھ دیا کہ ریشمین تنزیب کی ایک تہ رکھ کر یا ریک بخیہ کر دی جائے کہ اس پر جوتا گانٹھنے والے ہنسیں گے مثل مشہور ہے کہ ٹاٹ میں ریشم کا بخیہ۔ اگر اس کتاب میں ایسا لکھا ہو تو کہا جائے گا کہ مصنف بالکل ناتجربہ کار ہے نہ خود اس کام کو جانتا تھا نہ کسی جاننے والے سے پوچھ کر لکھا۔ تو اب سمجھئے کہ قرآن مذہبی کتاب ہے اس کا موضوع اصلاح روحانی ہے تو اس کے اصلی مضامین وہی ہو سکتے ہیں جن کو اصلاح ارواح میں دخل ہو ہاں بالتبع[۳] کسی اصلی مضمون کے ثابت کرنے کے لئے دیگر کوئی مضمون بھی آسکتا ہے بشرطیکہ دونوں مذکورہ شرطیں ملحوظ رہیں یعنی نہ وہ دوسرا مضمون ضرورت کی حد سے بڑھے اور نہ وہ غلط ہو۔ قرآن کے اصلی مضامین توحید، رسالت، معاد، عبادات وغیرہ ہیں۔ اور ان کے

۱؎ یعنی صحیح کے صفحے۔ ۱۲ ۲؎ مقصد کو چھوڑ نکلنا۔ ۱۲ ۳؎ تبعاً۔ ۱۲۔

اصلاح ارواح ہے) اثبات کے لئے کہ سہل واقرب طریق اس کا استدلال
بالمصنوعات ہے کہیں کہیں اجمالاً واختصاراً بعض مضامین خلق سموات وارض
انسان حیوان وغیرہ کا بیان ہوا بھی ہے اور چونکہ تفصیل کی حاجت نہ تھی اس

بالتبع دیگر مضامین بھی آگئے ہیں مثلاً وجود صانع اور توحید کے ثابت کرنے کے لئے مصنوعات یعنی کائنات دنیا زمین و آسمان وموالید ثلثہ انسان حیوان نباتات جمادات کا ذکر بھی آگیا ہے اسی کو آج کل سائنس کہتے ہیں کیونکہ صانع کے وجود کے اثبات کے لئے سہل تر اور قریب تر طریقہ بھی ہے کہ مصنوعات سے استدلال کیا جائے جیسا کہ کہا ہے:۔

البعرۃ تدل علی البعیر و	ایک مینگنی پتہ دیتی ہے اونٹ کا اور
الاثر یدل علی المسیر فالسماء	نشانِ قدم پتہ دیتا ہے چلنے کا تو آسمان بڑا
ذات الابراج والارض ذات	عالم خدائے حکیم وخبیر کا پتہ کیوں نہ
الفجاج کیف لا یدلان علی	دے گا۔
الحکیم الخبیر	

توحید بھی مصنوعات کے وجود سے ثابت ہوتی ہے جیسا کہ آیت لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا میں استدلال کیا گیا ہے۔ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اگر ہوتے آسمان و زمین میں معبود زائد ایک سے تو زمین و آسمان صحیح سالم نہ رہتے۔ تو بنا بر شرط اول مناسب بلکہ واجب ہے کہ دیگر مضامین (سائنس) کا بیان قدر ضروری سے

لئے اس کا ذکر نہیں ہوا۔ غرض سائنس کے مسائل اس کے مقاصد سے نہیں البتہ بضرورت تائید مقصود کے جتنا کچھ اس میں بدلالت قطعیہ مذکور ہے وہ یقیناً اور قطعاً صحیح ہے کسی دوسری دلیل سے اس کے خلاف کا

زیادہ نہ ہوا اگر ایسا ہوگا تو قرآن قرآن نہ رہے گا بلکہ نعوذ باللہ وہی کارخانہ کی فہرست ہو جائے گا۔ (یہاں سے وہ لوگ اپنی غلطی کو سمجھیں جو سائنس کی ہر بات کو قرآن میں تلاش کیا کرتے ہیں کہ یہ قرآن کے لئے عیب ہے یا کمال) اور بنا بر شرط دوم واجب ہے کہ مصنوعات کے متعلق جو کچھ بیان قرآن میں ہو وہ صحیح اور مطابق واقع کے ہو ہم قرآن میں دونوں شرطیں علی وجہ الکمال پاتے ہیں۔ سائنس وغیرہ کا بیان جہاں کہیں ہے تبعاً ہے اور بقدر ضرورت سے زیادہ نہیں نہ کوئی سورت اس کے لئے مخصوص ہے نہ طول طویل بیان کہیں ہے اور جہاں کہیں ذکر آیا ہے وہ صحیح ہے ہمارا دعوے ہے کہ قرآن پاک میں جس قدر بیان کائنات دنیا کا آیا ہے وہ بالکل صحیح اور مطابق واقع کے ہے قیامت تک کوئی اس کو غلط نہیں ثابت کر سکتا بشرطیکہ قرآن میں وہ بیان ایسے الفاظ سے ہوا ہو کہ ان کی دلالت اس مضمون پر قطعی ہو یعنی اس میں کسی دوسرے معنے کا احتمال ہی نہ ہو۔ جیسے ابتدا آفرینش انسان کے بارہ میں متعدد جگہ آیا ہے کہ ابوالبشر آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا پھر ان کی نسل بطریق متعارف چلائی اور آج کل کا ایک سائنس دان ڈارون کہتا ہے کہ انسان بندر تھا بطریق نشو یعنی ترقی کرتے کرتے

اعتقاد جائز نہیں اگر کوئی دوسری دلیل اس کے معارض ہوگی بعد تحقیق وہ
دلیل ہی مندوش ہوگی یا تعارض کا شبہ[1] عائد ہوگا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے

انسان ہوگیا۔ ہم کہتے ہیں کہ پچاس ڈارون بھی جمع ہو کر کوشش کریں گے تو آیت کے خلاف اس اپنے دعوے کو ثابت نہیں کر سکیں گے جو دلیل اس نے بیان کی ہے بالکل تخمین اور وہم اور طفلانہ حرکت ہے جیسا کہ آگے انشاء اللہ سمجھ میں آتا ہے اگر تخمین اور وہم سے کوئی بات ثابت ہوسکتی ہے تو ہر شخص کا وہم و تخمین علیحدہ ہے ہر شخص جو چاہے بک سکتا ہے ہم نے ایسے آدمی بھی دیکھے ہیں جو ریل کو ڈنڈوت کرتے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ جب تک ایک انسان کے بچہ کو بطور بھینٹ چڑھانے کے انجن میں نہ ڈال دیا جائے اس وقت تک ریل نہیں چلتی اور اس وقت بہت لوگ موجود ہیں جو سیتلا کو پوجتے ہیں اور اس سے ایسا ڈرتے ہیں جیسے شیر اور بھیڑیے سے اور بہت لوگ شگون کو ماننے والے ہیں اور اس پر وہ ڈارون کی طرح کچھ شواہد اور ثبوت بھی رکھتے ہیں تو کیا یہ بھی کسی درجہ تحقیق میں آسکتا ہے۔ حاشا و کلا۔ ان سب کا جواب یہی ہے کہ جو دلیلیں تم پیش کرتے ہو وہ محض وہمی اور تخمینی اور خیالی ہیں تحقیق کے لئے دلیل قطعی اور محقق کی ضرورت ہے اسلامی نظریہ یہ ہے:

إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا　　بیشک تخمینہ حق کو بالکل ثابت نہیں کرسکتا۔

---

[1] جس کی صورتیں اور احکام اصول موضوعہ ۳ میں مذکور ہیں ۱۲

جو لوگ ڈارون کے مقلد ہیں وہ سیتلا کی پرستش اور شگون کی نفی پر کیا دلیل لا سکتے
ہیں حضرت مصنف مدظلہ کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ جو دلیل قرآن کے معارض
ہوگی وہی مخدوش ہوگی اور غیر قابلِ وثوق ثابت ہوگی اور قرآن کا مضمون صحیح رہے گا
اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس دلیل اور آیت قرآنی میں واقع میں تعارض ہی نہ ہو بلکہ
کسی کو تعارض کا شبہ ہو گیا ہو اس صورت میں اس شبہ کو حل کر دیا جائے
تو اب تحقیق سائنس اور قرآن میں تعارض نہ رہے گا اور قرآن کا مضمون صحیح رہے گا۔
ہاں بعض وقت ایسا ہو سکتا ہے کہ سائنس کی تحقیق قرآن کے خلاف معلوم ہوتی ہے
اور وہ تحقیق سائنس کی بدیہی اور یقینی ہے مگر جب غور کیا گیا تو ثابت ہوا کہ جو معنے
آیت قرآنی کے سمجھے گئے جن کی بنا پر تحقیق سائنس سے تعارض ہوا وہ معنے ایسے یقینی نہیں جن کو ہم نے
یقینی درجہ اول سے تعبیر کیا تھا بلکہ یقینی درجہ دوم کے ہیں جس کو اصطلاح علماء میں ظنی کہتے ہیں تو ظاہر ہے
کہ جب آیت خود دوسرے معنے کا احتمال رکھتی ہے تو اس کے اس معنے کو جس کی بنا پر تعارض ہوتا ہے
متعین کر دینا زبردستی اور ظنی کو قطعی بنانا ہے لہذا دوسرے معنے مراد لیے لیں گے
تاکہ تعارض نہ ہو قرآن شریف میں ایسا بہت جگہ ہے لیکن ایسا کہیں ایک جگہ
بھی نہیں کہ کوئی مضمون بالفاظ قطعی الدلالت سائنس کے کسی قطعی تحقیق کے خلاف
ہو۔ اگر کسی کو کوئی ایسا موقع نظر پڑے تو چاہئے کہ علماء کے سامنے پیش کرے۔
انشاء اللہ تعالےٰ وہ دلیل ہی سائنس کی غلط ثابت کر دی جائے گی اور نہ
مضمون قرآنی پر غبار نہ آئے گا۔ اور یہ اسلام ہی کی خصوصیت ہے اسی بنا پر

کہ دلالت آیت کی قطعی نہ ہو اس کے خلاف پر ممکن ہے کہ جب دلیل صحیح قائم ہو وہاں نص قرآنی کو ظاہر سے منصرف کر لیں گے جیسا اصول موضوعہ نمبر ۵ میں تحقیق ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ اسلام فطرت کے مطابق ہے جیسا کہ قرآن شریف میں ہے
فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْہَا یعنی اس دین کو لو جو اس فطرت الٰہی کے مطابق ہے جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی کوئی قطعی تحقیق سائنس کی کسی قطعی تحقیق کے خلاف نہیں شکایت یہ ہے کہ ہمارے بھائی قطعی اور ظنی کا لحاظ نہیں کرتے سائنس کی ہر تحقیق کو یقینی (قطعی) سمجھ لیتے ہیں خواہ وہ افواہاً ہی مشہور ہوئی ہو اور خواہ وہ اپریل فول ہی کی جنس سے ہو جیسا ایک دفعہ مشہور ہوا تھا کہ کوئی سائنس دان مریخ میں پہنچ گیا[۱] اور وہاں دودھ کی نہریں وغیرہ دیکھیں بعد میں ثابت ہوا کہ یہ اپریل فول تھا۔ بلکہ ہمارا خیال ہے کہ ہمارے بھائی قطعی اور ظنی کی حقیقت کو بھی نہیں سمجھتے بس سائنس کے اقوال پر ان کو اطمینان ہو جاتا ہے اور شریعت کی باتوں پر نہیں ہوتا ان کو چاہیے کہ قطعی اور ظنی کی حقیقت کو سمجھیں اور سائنس کی ہر بکواس پر اطمینان نہ کریں بلکہ غور کریں کہ

---

[۱] ہمارا یہ مطلب نہیں کہ مریخ میں پہنچنا ناممکن ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس خبر کو بلا تحقیق یقینی سمجھ لیا گیا مریخ میں پہنچنے کے متعلق حضرت مصنف مدظلہ کا ملفوظ ہے کہ جس دن یہ خبر پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے گی تو میں دو رکعت نفل خوشی کے پڑھوں گا کیونکہ اس سے مسئلہ معراج بالکل ثابت ہو جائے گا۔ ۱۲ منہ

دوسری غلطی یہ ہے کہ اس اوپر کی تقریر سے معلوم ہوا کہ ایسے مسائل قرآن کے مقاصد میں سے نہیں بلکہ مقدمات مقصود سے

وہ قول سائنس کا قطعی ہے یا ظنی ہم دعوے کرتے ہیں کہ سائنس کے اقوال فی صدی نوے ظنی نکلیں گے پھر ان ظنیات کا مقابلہ دلائل شرعیہ ظنیہ سے بھی نہیں ہو سکتا چہ جائے کہ دلائل قطعیہ شرعیہ سے مقابلہ کیا جاتا ہے یہ کس قدر ظلم ہے اس موقع پر مناسب ہے کہ ناظرین اصول موضوعہ نمبر پر نظر ڈال لیں جس میں دلائل شرعیہ اور دلائل عقلیہ کے تعارض کی صورتیں بیان کی گئیں ہیں اور نہایت منصفانہ بحث کی گئی ہے۔ یہاں بھی ہم اس کا خلاصہ بہت تھوڑے الفاظ میں لکھے دیتے ہیں کیونکہ ہمیں امید نہیں کہ حضرات ناظرین اصول موضوعہ نمبر کی تلاش کے لئے تھوڑے سے ورق لوٹنے کی تکلیف بھی گوارا کریں گے۔ وہ خلاصہ یہ ہے کہ دلیل نقلی اور عقلی میں تعارض ہونے کی چار صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اول یہ کہ دلیل نقلی بھی قطعی یعنے یقینی درجہ اول کی ہو اور دلیل عقلی بھی یقینی درجہ اول کی ہو۔ دوسری یہ کہ دلیل نقلی یقینی درجہ اول کی ہو اور دلیل عقلی یقینی درجہ دوم کی ہو۔ تیسری صورت یہ کہ دلیل نقلی یقینی درجہ دوم کی ہو اور دلیل عقلی یقینی درجہ اول کی ہو۔ چوتھی صورت یہ کہ دلیل نقلی بھی درجہ دوم کی ہو اور دلیل عقلی بھی درجہ دوم کی ہو۔ صورت اول کی نسبت دعوے کیا گیا ہے کہ کبھی واقع نہ ہوگی یہ اسلام کی خصوصیات میں سے ہے کہ کوئی قطعی تحقیق اس کی ایسی نہیں جو دلیل نقلی یقینی کے خلاف ہو۔ اور

ہیں اور ظاہر ہے کہ استدلال میں مقدمات ایسے ہونا چاہئیں جو پہلے
سے یعنی قبل اثبات مدعا کے مخاطب کے نزدیک مسلم ہوں یا بدیہی ہوں
یا بدلیل مسلم کرا دیئے جائیں ورنہ ان سے مدعا پر استدلال ہی نہ ہوسکے گا۔

صورت دوم میں ظاہر ہے کہ ترجیح دلیل نقلی کو ہوگی کیونکہ وہ یقینی ہے اور عقلی غیر یقینی۔ اور صورت سوم میں ترجیح دلیل عقلی کو ہوگی بایں معنے کہ دلیل نقلی ظنی ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں کسی دوسرے معنے کا بھی احتمال ہے تو دلیل عقلی قطعی کی وجہ سے دلیل نقلی اپنے دوسرے معنے پر جس کو وہ محتمل ہے محمول کر لی جائے گی اور چوتھی صورت کا حکم ظاہر ہے کہ جب دونوں دلیلیں درجہ دوم کی ہیں تو اس کی کیا وجہ کہ دلیل نقلی کو چھوڑ کر عقلی کو اختیار کیا جائے یہ خلاصہ ہے دلائل عقلیہ و نقلیہ کے تعارض کا اور پورا بیان شافی و کافی اصول موضوعہ نمبر ۵ کے تحت میں عرض کیا گیا اس کو دیکھ لینا ضروری ہے سائنس کی ہر تحقیق پر ایمان لے آنا کورانہ تقلید ہے علماء کے سامنے پیش کیجئے اول تو تعارض ہی نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو سائنس کی دلیل ہی مخدوش نکلے گی غرض سائنس کا بیان جس قدر بھی قرآن میں آیا ہے بالکل صحیح ہے کبھی قیامت تک کوئی ثابت نہیں کر سکتا کہ ایک بات بھی قرآن کی جو دلالت قطعی سے ثابت ہو سائنس کی تحقیق قطعی کے خلاف ہے مگر جو کچھ بیان قرآن میں سائنس کے متعلق آیا ہے وہ تبعاً اور کسی مقصود اصلی یعنی اصلاح روحانی کے کسی مسئلہ کے اثبات کے لئے آیا ہے مثلاً اثبات توحید و معاد کے لئے۔ اور تابع کو مقصود کی برابر

جب یہ بات معلوم ہوگئی تو اب سمجھنا چاہیئے کہ اگر یہ جدید تحقیقات ان
آیات قرآنیہ کے مدلولات و مفہومات ہوں اور ظاہر ہے کہ عرب کے

کر دینا یا مقصود سمجھ لینا غلطی ہے خلاصہ یہ کہ سائنس کے مسائل مقاصد قرآن میں سے نہیں اور جب ثابت ہوگیا کہ سائنس کے مسائل مقاصد قرآن نہیں ہیں بلکہ مقدمات مقاصد ہیں جن سے مقاصد کے اثبات میں مدد ملتی ہے اور اسی غرض سے قرآن میں آئے ہیں تو اس سے ایک اور غلطی کا انکشاف بھی ہوا - اس کے بیان کے لئے ایک تمہید کی ضرورت ہے وہ تمہید یہ ہے کہ ایک دعویٰ ہوتا ہے اور ایک اس کی دلیل - دلیل سے دعوے کو ثابت کیا جاتا ہے - دلیل کے کچھ اجزاء ہوتے ہیں ان کو مقدمات کہتے ہیں - ظاہر ہے کہ دعوے کے ثابت کرنے کے لئے دلیل کی ضرورت اس واسطے ہوتی ہے کہ وہ دعوے مخاطب کو تسلیم نہیں ہوتا اس دلیل کے ذریعہ سے اس کو تسلیم کرایا جاتا ہے - ہر ادنیٰ سی عقل والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ وہ مقدمات ایسے ہونے چاہئیں کہ مخاطب کے نزدیک مسلم ہوں ورنہ وہ مقدمات خود دعوے ہوں گے جن کے ثابت کرنے کے لئے دوسری دلیل کی ضرورت ہوگی اور اس دلیل میں بھی یہی کلام ہوگا کہ وہ ایسے مقدمات سے مرتب ہونی چاہیئے جو مسلم ہوں ورنہ وہ بھی دعوے ہوں گے اور ان کے لئے بھی اور دلیل کی ضرورت ہوگی - غرض جن کو مقدمات دلیل کہا جاوے وہ مقدمات جبھی بن سکتے ہیں جبکہ مخاطب کے نزدیک مسلم ہوں اور مسلم ہونے کی

لوگ جو اول مخاطب ہیں قرآن کے وہ بالکل ان تحقیقات سے ناآشنا
تھے تو لازم آتا ہے کہ مقدمات غیر مسلمہ و غیر بدیہیہ و غیر منبہہ سے

دو صورتیں ہوتی ہیں یا تو وہ ایسے بدیہی ہوں جو سب کے نزدیک بلا دلیل مسلم ہوں جیسے کہا جائے کہ اس وقت دن ہے کیونکہ آفتاب نکل چکا ہے۔ اس جملہ میں اس وقت دن ہے دعوے ہے اور آفتاب نکل چکا ہے دلیل ہے یہ بدیہی ہے یعنی اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں آفتاب ہر شخص کو نظر آتا ہے۔ یا اگر بدیہی نہ ہوں تو اس دلیل کا مقدمہ بنانے سے پہلے ان کو مسلم کرا دیا گیا ہو پہلے وہ مقدمات بھی دعوے تھے لیکن ان کو دیگر دلیل سے ثابت کر کے مخاطب کو تسلیم کرا دیا گیا تو اب وہ اس دلیل کے مقدمات بننے کے قابل ہو گئے اس کی مثال یہ ہے کہ اقلیدس کی تیسری شکل کے ثابت کرنے کے لئے بعض اجزاء کی نسبت کہا جاتا ہے بحکم شکل ثانی یہ کہنا کہ بحکم شکل ثانی یہ مقدمہ ہے تیسری شکل کے ثبوت کے لئے لیکن شکل ثانی خود بدیہی نہیں ہے بلکہ ثبوت کی محتاج ہے تاوقتیکہ اس کو شکل اول اور اصول موضوعہ اور علوم متعارفہ سے ثابت نہ کرایا جائے اس وقت تک تیسری شکل کے لئے مقدمہ نہیں بن سکتی اور جب ثابت کر دیا جائے تو اب تیسری شکل کے لئے مقدمہ بن سکتی ہے غرض دلیل کے مقدمات ہمیشہ مخاطب کے نزدیک مسلم ہونے چاہئیں خواہ بوجہ بدیہی ہونے کے مسلم ہوں یا دلیل سے ان کو مسلم کرا دیا گیا ہو اگر مقدمات ایسے نہ ہوں گے تو ان سے استدلال کرنا

استدلال کیا گیا ہے جن میں استدلال کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔
تو کلام اللہ کے طرز استدلال پر کتنا بڑا دھبّہ لگے گا۔ تیسری خرابی

غلط ہوگا اور وہ دعوے ثابت نہ ہوگا اس تمہید کے بعد سمجھئے کہ جب قرآن پاک
نازل ہوا تو جن کے سامنے نازل ہوا سب سے پہلے انہی کو دلائل سے توحید
معاد و دیگر امور دینی کو تسلیم کرایا گیا۔ وہ کون ہیں اہل عرب، جو نہ سائنس قدیم کو جانتے
تھے اور نہ جدیدہ کو (جدیدہ کا تو وجود ہی اس وقت نہ تھا) تو اگر ان کے سامنے
دلیل میں ایسے مقدمات بیان کئے گئے جن کے وہ مفہوم کو بھی نہ سمجھیں تو کیسے
ان کو تسلیم کریں گے اور کیسے ان کے سامنے مدعا ثابت ہوگا یہ تو ایسا ہوگا
جیسے کوئی ایک اردو خواں کے سامنے عربی زبان میں تقریر کرے تو اردو خواں
اس کی کسی بات کو تسلیم کر سکتا ہے؟ ع:

زبان یار من ترکی و من ترکی نمیدانم[1]

اسی وجہ سے قرآن میں بھی ارشاد ہے:۔

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا أَعْجَمِيًّا لَّقَالُوا لَوْلَا فُصِّلَتْ آيَاتُهُ یعنی اگر ہم قرآن کو غیر عربی زبان میں اتارتے تو اہل عرب کہتے کہ اس کی آیتیں صاف (سمجھنے کے قابل) کیوں نہیں کی گئیں۔

وجہ یہی ہے کہ مخاطب کسی بات کو مان جبھی سکتا ہے اور کسی حکم کی تعمیل بھی جب ہی
کر سکتا ہے جب کہ اس کو سمجھ لے۔ اگر اہل عرب سے ایسی باتوں کے ساتھ
خطاب کیا گیا جس کو وہ سمجھ بھی نہ سکے تو وہ اس کو کیا تسلیم کر سکتے تھے تو اب

---

[1] یعنی میرے یار کی زبان ترکی ہے اور مجھے ترکی نہیں آتی ۱۲

اس میں یہ ہے کہ یہ تحقیقات کبھی غلط بھی ثابت ہوتی رہتی ہیں سو اگر ان کو

دو حال سے خالی نہیں یا تو ان کو مخاطب بنانا منظور ہی نہ تھا یا منظور رکھا اور
زبردستی[لہ] منواتا تھا اور یہ دونوں باتیں عقل و نقل کے خلاف ہیں نقل سے
خلاف ہونا تو ظاہر ہے جو کوئی بھی دوسرے کے سامنے بات کرتا ہے تو اصل تو
یہی ہے کہ اس کو مخاطب بنانے کے لئے کرتا ہے ہاں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مخاطب
دوسرے کو بناتا ہے اور اس شخص کو اس پیغام کے پہنچانے کے لئے صرف واسطہ
بنایا جاتا ہے مگر قرآن کے مخاطب اول تو عرب یقیناً ہیں شاید کوئی ذہین آدمی
کہنے لگے کہ قرآن بھی عرب پر اسی غرض سے اترا ہے کہ وہ بعد کے لوگوں کو پہنچا دیں
اس کا جواب یہ ہے کہ واقعات سے اس کی تکذیب ہوتی ہے کیونکہ قرآن نجماً نجماً
اترا ہے واقعات پیش آتے گئے اور آیتیں اترتی گئیں واقعات عرب کو پیش آئے
تو آیتیں ضرور ان کے واسطے اتریں دوسرے اگر عرب کو خطاب نہیں تھا تو کیا
ان کو غیر مکلف چھوڑ دیا گیا۔ تیسرے اگر قرآن کے مدلولات وہ ہیں جو عرب
نہ سمجھے تھے اور آج کل کے لوگوں نے سمجھا ہے اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ عرب
صرف حامل قرآن اور ناقل تھے مخاطب اصل آج کل کے سائنسدان ہیں تو دیکھا
جاتا ہے کہ سائنس کی ترقی جاری ہے اور بہت سے انکشافات نئے نئے
ہوتے جاتے ہیں اگر یہی رسم جاری رہی کہ سائنس کی تحقیق کو قرآن میں ٹھونسا
جائے تو آئندہ ہر نسل کو یہ کہنے کا حق ہوگا کہ شاید قرآن کے مخاطب اصل بعد

لہ زبردستی ۔ ۱۲

قرآنی مدلول بنایا جائے تو اگر کسی وقت کسی تحقیق کا غلط ہونا ثابت ہو گیا اور
اہل اسلام کا اقرار بضمن ایسی تفسیر کے مدون ہوگا کہ قرآن کا یہ دعویٰ ہے
تو اس وقت ایک ادنیٰ ملحد تکذیب قرآن پر نہایت آسانی سے قادر ہو سکے گا کہ
قرآن کا یہ مضمون غلط ہے اور جزو کا ارتفاع مستلزم ہے ارتفاع کل کو پس قرآن

کے لوگ ہوں ہم لوگ صرف حامل و ناقل ہوں اور یہی سلسلہ برابر نسلاً بعد نسل
رہے گا تو شاید مخاطبین قرآن بصحیح معنوں میں وہ ہوں گے جن کے بعد کوئی
نسل نہ رہے یعنی جن پر قیامت قائم ہوگی جس بعد سائنس کی ترقی منقطع ہو جائے
گی وھل ھذا الا الجنون اور نقل کے خلاف ہونا قرآن پڑھنے والوں پر ظاہر
ہے کیونکہ اس قسم کی آیتیں موجود ہیں۔

اِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا	بے شک ہم نے ہی بنایا ہے اس کو قرآن عربی
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ	تاکہ تم سمجھ لو۔
وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ	اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر تمام کے
بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا۔	تمام لوگوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر۔

عرب بھی "کافۃ للناس" میں داخل ہیں اور تحکم سے بھی کام نہیں لیا گیا بدلیل قولہ
تعالیٰ

لَاۤ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ	دین میں زبردستی (جبر تحکم) نہیں ہدایت
الرُّشْدُ مِنَ الْغَىِّ	اور گمراہی متمیز ہو چکے۔

لہ یہ سوائے جنون کے اور کیا ہے ۱۲

صادق نہ رہا اس وقت کیسی دشواری ہوگی - اور اگر کوئی شخص یہ احتمال
نکالے جیسا کہ بعض نے دعویٰ بھی کیا ہے کہ قرآن میں یہ کمال ہے کہ جس
زمانہ میں جو بات ہو اس کے الفاظ اسی کے موافق ہو جاتے ہیں سو اس بنا
پر تو یہ لازم آتا ہے کہ قرآن کا کوئی مدلول بھی قابل اعتماد نہیں ہے مدلول میں
احتمال اس کے نقیض کا بھی ہے -

. . . . تبین کے لفظ پر بھی غور کریں ماضی کا صیغہ ہے جس
کا صاف مفہوم یہ ہے کہ طریق ہدایت اس طرح صاف صاف بیان کر دیا گیا کہ
طریق ضلالت سے بالکل متمیز ہو گیا تو اگر آیات قرآنی ایسی ہیں کہ عرب نے سمجھی
بھی نہیں تو تبین کہاں صحیح ہوا اور فرمایا ہے :-

أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّىٰ ‎ یعنی کیا آپ کا کام یہ ہے کہ مجبور کریں لوگوں
يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ‎ کو کہ وہ ایمان لے آئیں ؟

(اور جہاد سے تحکم و اکراہ کا شبہ نہ کیا جاوے کیونکہ جہاد بعد تبین ہوتا ہے تو
وہ درحقیقت تحکم و اکراہ ہی نہیں)

وفی الباب غیرھا من ‎ اور اس سلسلے میں بے شمار آیات
الآیات التی لا تحصیٰ ‎ ہیں -

غرض یہ بات بداہۃً ثابت ہے کہ عرب کو بھی قرآن کے ساتھ خطاب فرمانا
مقصود تھا بلکہ مخاطب اول وہی تھے پھر ان کے سامنے ایسے دلائل پیش کرنا

جس کو وہ نہ سمجھ سکیں اور ان کے مقدمات ان کے نزدیک مسلم نہ ہوں بالکل عبث ہے لامحالہ ماننا پڑے گا کہ ان کے مدلولات وہی تھے جو اس وقت کے لوگ سمجھتے تھے ورنہ کلام اللہ کے طرز استدلال پر جیسا دھبہ لگے گا ظاہر ہے سائنس پرستی کی بدولت اس کلام کی یہ گت بنی جس کے سامنے تمام دنیا کے فصحا و بلغا اور حکما اور عقلا ہمیشہ عاجز رہے ہیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار — اے اہل عقل عبرت پکڑو۔

غرض مسائل سائنس کو قرآن میں داخل کرنے میں ایک خرابی یہ ہوئی کہ قرآن کے موضوع کو نہیں سمجھا اور غیر موضوع کے داخل ہونے کو کمال سمجھا۔ دوسری یہ کہ جب ثابت ہو گیا کہ مسائل سائنس جس قدر بھی قرآن میں آئے ہیں بطور[ل] مقدمات بضرورت استدلال علی المقاصد آئے ہیں اور استدلال مقدمات مسلمہ سے ہو سکتا ہے اور موجودہ مسائل سائنس بوقت نزول قرآن معلوم و مسلم نہ تھے لہذا ان سے استدلال نہیں ہو سکتا تھا۔ تیسری خرابی بہت بڑی یہ بھی ہے کہ سائنس کی تحقیقات بدلتی رہتی ہیں بہت سی تحقیقات ایسی ہیں کہ ایک مدت تک ان کو بالاتفاق یقینی طور پر تمام دنیا کے سائنس دانوں نے مانا لیکن اب ان کو غلط کہا جاتا ہے ان کی ضد کو حق مانا جاتا ہے اس کی مثال میں ہم سائنس کی تحقیق پیش کرتے ہیں جو صدیوں تک متفق علیہ رہی مگر اب اس کو غلط کہا جاتا ہے وہ یہ تحقیق ہے کہ جس چیز میں روشنی نکلتی ہے وہ چیز کم ہوتی جاتی ہے اسی بنا پر یہ مانا گیا تھا کہ آفتاب بھی

[ل] یعنی بطور مقدمات وارد ہیں جن کو مقصود کے لئے دلیل بنانا منظور ہے۔ ۱۲

گھس گیا پھر دوربینوں سے بھی اس کی تائید ہوئی حتیٰ کہ گھسنے کی رفتار کا حساب لگا کر بعض عقلمندوں نے پیشین گوئی کر دی کہ اتنے عرصہ میں جرمِ[1] آفتاب بالکل ختم ہو جائے گا اور چونکہ کائنات کے نشو و نما کا اکثر حصّہ حرارت ہی پر موقوف ہے لہذا بوجہ حرارت نہ رہنے کے کائنات بھی نہ رہے گی۔ اور دنیا ختم ہو جائے گی ہمارے سائنس کے دلدادہ بھائیوں نے اس کو قرآن میں اس طرح ٹھونسا کہ قرآن میں تیرہ سو برس سے قیامت کی خبر موجود ہے یہ وہی قیامت[2] ہے غرض یہ تحقیق بالکل مسلم تھی کہ روشنی دینے والی چیز کم ہوتی چلی جاتی ہے لیکن ریڈیم کی ایجاد کے بعد سے اس تحقیق کو غلط کہا جاتا ہے کیونکہ ثابت ہو گیا ہے کہ باوجود روشنی دینے کے ریڈیم کم نہیں ہوتی جب ایسی زبردست تحقیق کی یہ حالت ہے تو دیگر تحقیقات کی حالت معلوم کریں اب سائنس داں اصحاب غور کریں کہ اگر سائنس کی تحقیقات کو جزو قرآن بنایا گیا اور تفسیر میں ان کو درج کر دیا گیا جس میں اقرار ہو اس بات کا کہ یہ قرآن سے ثابت ہے جیسا کہ بعض لوگ آج کل کر رہے ہیں اور آئندہ کسی زمانہ میں وہ تحقیق غلط ثابت ہو گئی تو مخالفین کو کس سہولت سے یہ کہنے کا حق ہوگا کہ قرآن کی یہ تحقیق غلط ہے اور جب قرآن میں

---

[2] یاد رکھیں کہ یہ وہ قیامت نہیں جس کی خبر قرآن و حدیث میں ہے مطلق فنا کا نام قیامت نہیں بلکہ قیامت حشر و نشر و جزا و سزا و وزن اعمال و عبور علی الصراط وغیرہ تمام چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے ہمارے بھائی سائنس کی تحقیق پر اطمینان کر کے فنائے عالم تک تو قائل ہو گئے لیکن وزن اعمال و پل صراط وغیرہ پر اطمینان نہیں رکھتے جائے تعجب ہے ۱۲ منہ

[1] جسم ۱۲

ایک دو غلطی بھی ثابت کر دی گئیں تو کل قرآن کا غلط ہونا ثابت ہو جائے گا۔
کیونکہ مجموعہ غلط اور صحیح کا غلط ہی ہوتا ہے اس کا جواب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ مگر
شاباش اور آفرین ہے بعض ذہین لوگوں کو کہ اس کا جواب بھی تجویز کر لیا وہ یہ
ہے کہ کہتے ہیں کہ قرآن کا یہ بھی کمال ہے کہ جس زمانہ میں جو بات ثابت ہو جائے
قرآن کے الفاظ اسی کے موافق ہو جاتے ہیں ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس کا
مطلب کیا ہے کیا کوئی کلام نفی اور اثبات دونوں کے لئے محتمل ہو سکتا ہے
یہ تو کھلا ہوا اجتماع نقیضین ہے جو محال عقلی ہے ہمارے بھائی تو ذرا سے استبعاد
پر بھی محال محال پکار اٹھتے ہیں اجتماع نقیضین کو ان کے دل نے کیسے مان لیا
کسی ادنیٰ سے عاقل کے کلام میں بھی یہ عیب نہیں ہو سکتا چہ جائے کہ خدائے تعالیٰ
کے کلام میں مثلاً اس وقت سائنس دان کہتے ہیں کہ زمین متحرک ہے اس
مسئلہ کو ہمارے بھائیوں نے آیت

وھی تمر مر السحاب ۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ (پہاڑ) چلیں گے بادلوں کی طرح۔

سے ثابت کیا ہے چونکہ آیات قرآنی کو سب کی سب کو قطعی کہتے ہیں لہذا بزعم
ان کے حرکت ارض کا مسئلہ قطعی ہو گیا۔ اگر کل کو سائنس دانوں کی رائے بدل گئی
اور ثابت ہوا کہ زمین ساکن ہے یعنی اس مسئلہ کا نقیض ثابت ہو گیا تو کیا کوئی
صورت ایسی ہے کہ اسی آیت کے معنے بدل دیئے جائیں اور اس سے
بجائے حرکت کے سکون ثابت کر دیا جائے ہماری سمجھ میں اس کی کوئی صورت نہیں

تو یہ تو ایسی بات ہو گئی جیسے کسی چالاک نجومی کی حکایت ہے کہ اس سے جب پوچھا جاتا کہ ہمارے لڑکا ہو گا یا لڑکی وہ کہہ دیتا کہ لڑکا نہ لڑکی اور جو صورت واقع ہوتی باختلاف لب و لہجہ اس عبارت کو اس پر منطبق کر دیتا آئی کیونکہ آیت مذکورہ میں کسی تاویل کی بھی گنجائش نہیں اسی واسطے اس مسئلہ کو قطعی سمجھا گیا تھا اور آیت مذکورہ سے اس کو ثابت کیا گیا اور ثبوت قطعی جبھی ہو سکتا ہے جبکہ دلالت بھی قطعی پائی جائے اور یہ یاد ہو گا کہ کسی لفظ کی دلالت قطعی جبھی کہلاتی ہے کہ اس لفظ میں دوسرے معنی کا احتمال بھی نہ ہو تو جبکہ آیت مذکورہ سے حرکت ارض کا مسئلہ ثابت کیا گیا تو مان لیا گیا کہ آیت کے الفاظ میں کسی دوسرے معنی کا احتمال ہی نہیں اور جب وہ تحقیق اہل سائنس کی بدلی تو اب آیت میں دوسرے معنی کا احتمال کہاں سے نکل آئے گا غرض آیت مذکورہ سے تو کوئی صورت نہیں کہ سکون ارض ثابت کیا جا سکے ہاں ایک یہ صورت ہو سکتی ہے کہ کسی دوسری آیت کی طرف رجوع کیا جائے وہ آیت یہ ہے جس سے نیم ملا لوگ سکون ارض کا مسئلہ ثابت کیا کرتے ہیں:۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ قَرَارًا ۔ یعنی حق تعالٰی وہ ہے جس نے زمین کو تمہارے لئے ٹھہرنے کی جگہ بنایا

ظاہر ہے کہ ٹھہرنے کی جگہ وہی ہو سکتی ہے جو خود ٹھہری ہوئی ہو اس سے سکون ارض کا مسئلہ ثابت ہو گا اور یہ بھی بزعم دل دادگان سائنس کے قطعی ہو گا تو

کیا ایسی کتاب کو ہدایت نامہ کہنا صحیح ہوگا۔ چوتھی خرابی اس میں یہ ہے جو بالکل
ہی غیرت کے خلاف ہے کہ اس صورت میں اگر محققان یورپ یہ کہیں کہ
دیکھو قرآن کو نازل ہوئے اتنا زمانہ ہوا مگر آج تک کسی نے یہاں تک کہ خود
نبی نے بھی نہ سمجھا ہمارا احسان مانو کہ تفسیر ہماری بدولت سمجھ میں آئی تو اس

سکونِ ارض کا مسئلہ تو ثابت ہو جائے گا لیکن دو آیتوں میں تعارض ہوگا یہ تعارض
کسی طرح رفع نہیں ہو سکتا کیونکہ حرکت و سکون جمع نہیں ہو سکتے ان دونوں میں سے
جس کو بھی حق کہا جائے گا دوسرے کو باطل کہنا لازم ہوگا اب ہم نہیں سمجھ سکتے
کہ اس عبارت کے کیا معنے ہیں کہ (قرآن کا کمال ہے کہ جس زمانہ میں جو بات ثابت
ہو اس کے الفاظ اسی کے موافق ہو جاتے ہیں) آیت اول میں تو یہ بات نہ چلی کہ
اس سے بجائے حرکت ارض کے سکون ارض ثابت کیا جائے ہاں دوسری
آیت مل گئی جس سے سکون ارض ثابت کیا جا سکے تو اب اس عبارت کے معنے یہ ہونگے
کہ قرآن میں دو رخی باتیں ہیں کہیں ایک ہی چیز کی نفی ہے اور کہیں اسی کا اثبات
اور یہ جس درجہ بدترین عیب ہے ظاہر ہے ایک ادنیٰ سے عاقل کے کلام میں بھی ایسا
نہیں ہو سکتا چہ جائے کہ خدائے علیم و حکیم کے کلام میں قطع نظر اس تعارض سے جو
بعض آیتوں میں لازم آتا ہے اس میں یہ بھی خرابی ہے کہ جب اس بات کو مان لیا
گیا کہ ایک عبارت ایک مدلول پر دال ہونے کے ساتھ اس کے نقیض پر بھی دال
ہو سکتی ہے تو تمام قرآن شریف مشکوک ہو گیا کسی آیت کا بھی کوئی مدلول متعین نہیں

لا کیا جو ایسے ہو گا یہاں تک بیان تھا اُن فضیلتوں کا جو کلام اللہ کے متعلق واقع ہو رہی ہیں اب بقیہ دلائل کی نسبت عرض کرتا ہوں ؛

کیا جا سکتا کیونکہ احتمال اس کے خلاف کا بھی ہے ذرا ہمارے بھائی غور کریں کہ یہ کیا مجنونانہ حرکت ہے - ایک بچہ کے کلام میں بھی اس قسم کے احتمالات نہیں ہوتے چہ جائیکہ اس کلام میں جس کا دعویٰ ہے :-

فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ — ایک بات تو قرآن جیسی لے آئیں ؛

ہمارے بھائیوں نے ایسے معجز کلام کو ایسا بنا دیا جیسے کسی چالاک نجومی کا کلام تھا کہ اس سے پوچھا جاتا کہ ہمارے یہاں لڑکا ہو گا یا لڑکی تو وہ کہتا لڑکا ہو گا نہ لڑکی ۔ پس اگر لڑکا ہوا تو کہا دیکھو میں نے کہا نہ تھا کہ لڑکا ہو گا نہ کہ لڑکی - اور اگر لڑکی ہوئی تو کہا میں نے کہا نہ تھا کہ لڑکا ہو گا نہ یعنی نہیں - بلکہ لڑکی ہو گی - اور اگر کچھ نہ ہوا تو کہہ دیا میں نے کہا نہ تھا کہ نہ لڑکا ہو گا نہ لڑکی ۔

تَعَالَى اللهُ عَنْ ذٰلِكَ عُلُوًّا كَبِيْرًا — اللہ تعالےٰ ایسی باتوں سے پاک اور بلند ہے -

خدا کا کلام ہدایت کے واسطے اترا ہے اور ہدایت کہتے ہیں راہ حق دکھانے کو - اگر اس کی یہ شان ہے کہ اس کا کوئی مفہوم ہی متعین نہیں تو وہ کیا چیز بتائے گا ۔

لہ اس چوتھی خرابی کی تقریر بہت ظاہر ہے اس لئے اس کی شرح کی حاجت نہیں سمجھی ۱۲

انتباہ پنجم

متعلق حدیث منجملہ اصول اربعہ شرع

حدیث کے متعلق یہ غلطی ہے کہ اس کی نسبت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ حدیثیں محفوظ نہیں ہیں نہ لفظاً نہ معناً۔ لفظاً تو اس لئے کہ عہد نبوی میں حدیثیں کتابۃً جمع نہیں کی گئیں محض زبانی نقل در نقل کی عادت تھی۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ شرعی دلیلیں جن سے احکام اسلام ثابت کئے جاتے ہیں یعنی کتاب اللہ (قرآن) اور حدیث۔ اور اجماع امت اور قیاس۔ ان چاروں کے متعلق مسلمانان زمانہ کچھ غلطیوں میں مبتلا ہیں۔ کتاب اللہ کے متعلق جن غلطیوں میں مبتلا ہیں ان کا بیان ہو چکا۔ اب حدیث کے متعلق غلطیوں کا بیان ہوتا ہے۔ پہلی غلطی یہ ہے کہ حدیث کے قابل استدلال ہونے ہی میں کلام کیا جاتا ہے اس طرح کہ یہ مسلم ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام

صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات جن کو حدیث کہتے ہیں حضور کے زمانہ میں
لکھے نہیں جاتے تھے بلکہ سننے والے ان کو سن کر یاد رکھتے تھے ان لوگوں
کو صحابی کہتے ہیں پھر ان ارشادات کو صحابہ نے اپنے بعد کے لوگوں کو سنایا
ان لوگوں کو تابعی کہتے ہیں اکثر تابعین نے بھی اُن ارشادات کو لکھا نہیں
بلکہ حسب دستور سابق زبانی یاد رکھا اور اپنے بعد کے لوگوں کو سنایا ان
لوگوں کو تبع تابعی کہتے ہیں۔ اس قرن میں لکھنے کا رواج ہوا حاصل یہ ہوا
کہ احادیث قید کتابت میں تیسرے قرن میں آئیں جس کے لئے اگر یہ
کہا جائے کہ پچاس برس کے بعد لکھی گئیں تو بیجا نہیں۔ بغیر لکھنے
کے اتنے زمانہ تک الفاظ کا محفوظ رہنا عادۃً و فطرۃً محال ہے اور
جب یہ طے ہو گیا کہ الفاظ محفوظ نہیں رہے تو معانی کا محفوظ
نہ رہنا بھی واجب التسلیم ہے بنا بریں کہا جا سکتا ہے کہ تبع تابعین
تک جو ارشادات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہنچے اس کی صورت
یہی ہوئی کہ اوپر کے راویوں نے جو مطلب الفاظ سے سمجھا اس کو اپنے
دوسرے الفاظ سے مابعد کے لوگوں کے سامنے نقل کیا اور انہوں نے
بھی اپنے مابعد کے لوگوں کے سامنے ایسا ہی کیا تو دو دفعہ الفاظ میں تغیر تبدل ہوا تو
کہا جا سکتا ہے کہ ان ارشادات کے نہ الفاظ محفوظ رہے نہ معانی پھر ان سے
احکام شرعی ثابت کرنا اور ان کو اس درجہ قابل وثوق سمجھ لینا کہ ان کو فرض

واجب کہا جائے اور ان کے منکر پر طرح طرح کے فتوے لگائے جائیں کیسے قابل تسلیم ہو سکتا ہے یہ تقریر ہے آج کل کے آزاد خیال حضرات کے شبہ کی چنانچہ سرسید[1] نے ایک موقع پر صاف لکھ دیا کہ حدیثوں کا کیا اعتبار یہ تو زمانہ رسالت سے سینکڑوں برس کے بعد بنائی گئی ہیں اور یہی بنا ہے فرقۂ قرآنیہ کے مذہب کی کہ وہ کہتے ہیں کہ احکام دین صرف قرآن سے ثابت کئے جا سکتے ہیں اور بس اسی بنا پر نماز کی ایک رکعت بھی پڑھ لیتے ہیں اور روزہ صرف ایک مانتے ہیں۔

حقیقت حال یہ ہے کہ ان لوگوں نے سلف کو اپنے اوپر قیاس کیا تو جو حالت اپنے نقل و روایت کی دیکھی وہی ان کی نقل و روایت کی سمجھی۔ حالانکہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے ہم اس مضمون کو کسی قدر طول کے ساتھ

---

[1] ایک عیسائی نے ایک رسالہ امہات المومنین لکھا جس میں نعوذ باللہ ازواج مطہرات پر کچھ طعن کئے اور ان کے الٹے سیدھے ثبوت احادیث سے دیئے۔ بحمد اللہ اس کے جواب میں اہل اسلام کی طرف سے ایسے رسالے شائع ہوئے جن کے بعد کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہی۔ ایک رسالہ مرتب نے بھی لکھا جس میں صاف لکھ دیا کہ احادیث سے وہی ثابت ہوتا ہے جو علی کہتا ہے مگر احادیث کا کیا اعتبار یہ تو زمانہ رسالت سے صدیوں کے بعد بنائی گئی ہیں لہذا یہ اعتراضات قابل تسلیم نہیں ازواج مطہرات کی لا تعداد یعنی سوانح عمریاں لکھی جا چکی ہیں کہ وہ کس قدر پاکباز اور بہترین بیبیاں تھیں ان کی نسبت ایسے شبہات ہرگز قابل تسلیم نہیں پھر ہر ایک بیبی کی سوانح عمری لکھی۔ کوئی پوچھے کہ احادیث باوجود اسناد کے تو قابل اعتبار نہیں اور تواریخ بلا سند کے معتبر ہیں۔ دروغ گو را حافظہ نباشد ۱۲

لکھتے ہیں کیونکہ شریعت اسلامی کی ایک بڑی اصل اس پر موقوف ہے۔ جاننا چاہئے کہ روایت کا صحت کے ساتھ محفوظ رکھنا دو بات پر موقوف ہے ایک قوت ہوا تھا یہ [illegible] سروری عنہ کی ساتھ یعنی جس سے روایت کی جائے تعلق پر اور ان دونوں باتوں میں سے اصل دوسری بات ہے جب یہ موجود ہوتی ہے تو ضعیف حافظہ بھی قوی ہوجاتا ہے اور تعلق دو وجہ سے ہوتا ہے عظمت سے یا محبت سے۔ آدمی کے دل میں جس کی عظمت ہوتی ہے یا محبت ہوتی ہے تو اس کی بات ہرگز نہیں بھول سکتا جب چاہے تجربہ کر لیا جائے کہ ایک با اختیار حاکم یعنی ایسا حاکم جس کے اختیار میں موت و حیات ہو مثلاً فوجی جرنیل بر وقت جنگ یعنی جس وقت مارشل لا جاری ہو کسی کو حکم دے کہ میرا یہ پیغام زبانی فلاں جگہ پہنچا دے اور وہ حاکم یہ بھی کہہ دے کہ اگر ذرا تغیر و تبدل کیا تو اس کی سزا سوا موت کے کچھ نہ ہوگی تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ شخص اس حالت میں اس کے پیغام میں کچھ تغیر و تبدل کرے گا یا کوئی لفظ بھول جائے گا خوف وہ چیز ہے جس سے ایک اندھے کی آنکھ پیدا ہوگئی تھی جس سے نادرشاہ بادشاہ نے کہا تھا کہ اگر میرے لوٹ کر آنے تک تیری آنکھ درست نہ ہوگی تو تجھ کو قتل کر دوں گا (یہ قصہ تواریخ میں موجود ہے اور بہت مشہور ہے) یہ بادشاہ کی عظمت کا اثر تھا کہ اس بیچارہ اندھے نے نہایت عجز و انکساری سے حق تعالیٰ سے دعا مانگی اور حق تعالیٰ نے اس کی آنکھ درست کر دی اسی طرح

تو ایسا حافظہ کہ الفاظ تک یاد رہیں فطرت کے خلاف ہے اور معنیً اس لیئے کہ جب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا لا محالہ اس کا کچھ نہ کچھ مطلب سمجھا خواہ وہ آپ کی مراد کے موافق ہو یا غیر موافق ہو اور الفاظ محفوظ نہ رہے جیسا اوپر بیان ہُوا پس اسی اپنے سمجھے ہوئے کو دوسروں کے روبرو نقل کر دیا پس آپ کی مراد کا محفوظ رہنا بھی یقینی نہ ہوا جب نہ الفاظ محفوظ ہیں نہ معانی تو حدیث کس طرح حجت ہوئی (اور یہی حاصل ہے شبہ فرقۂ قرآنیہ کا) اور حقیقت میں یہ غلطی محدثین و فقہاءِ سلف کے حالات میں غور نہ کرنے سے پیدا ہوئی ہے ان کو ضعف حافظہ و قلت رغبت و قلت خشیت میں اپنے اوپر قیاس کیا ہے۔

شوق ۱۲ — خوف ۱۲

اگر کسی کا ایسا پیارا محبوب جس کو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہو فرمائش کرے کہ یہ میرا پیغام فلاں جگہ پہنچا دے اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دے کہ اگر ذرا بھی تغیر و تبدل کیا تو مجھ سے ملنے کی امید مت رکھنا تو کیا وہ اس کے پیغام میں کچھ تغیر تبدل کرے گا یا کوئی لفظ بھول جائے گا حاشا و کلا اس کے الفاظ اس کے ذہن میں نہ صرف اس وقت کے لئے بلکہ تمام عمر کے لئے نقشِ کالحجر ہو جائیں گے اور ان کو وظیفہ کی طرح بار بار پڑھا کرے گا - اب تو ذرا غور کو ملحوظ لیئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ صحابہ کو اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا تعلق تھا عظمت کہاں تک تھی اور محبت کس درجہ تھی ہم

بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں کوئی فرد بھی عظمت یا محبت کا پایا جائے گا تو وہ صحابہ کی عظمت و محبت کے سامنے اصل و نقل کی نسبت رکھتا ہوگا پروانہ و شمع اور بلبل و گل کی محبت بھی اس کا ظل اور عکس ثابت ہوگی۔ سچ کہا ہے ؎

افروختن و سوختن و جامہ دریدن[1]

پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت

دیکھئے زلیخا کی محبت حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ مشہور ہے اور ضرب المثل ہے لیکن حالت یہ ہے کہ جس وقت اپنے اوپر بات آپڑی اور عزیز مصر نے ان کو یوسف علیہ السلام کے پیچھے آتے دیکھ لیا تو محبوب کا خیال نہ رہا اور یہی منہ سے نکلا

مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوْءًا إِلَّا أَنْ يُّسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ

یعنی کیا سزا ہے اس شخص کی جس نے تیری اہل کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا سوا اس کے کہ قید کیا جائے یا سخت عذاب دیا جائے۔

اور بمقابلہ اس کے صحابہ کی محبت دیکھئے ایک صحابی ہیں حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ وہ ایک لڑائی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے حضورؐ پر غنیم کی طرف سے وار کئے جاتے تھے یہ ان کو اپنے ہاتھ پر لیتے تھے یہاں تک کہ ہاتھ بیکار ہوگیا، یہ ہے سچی محبت کہ اپنی جان کو محبوب کی جان کے سامنے کچھ نہیں

---

[1] جلنا اور تڑپنا اور کپڑے پھاڑنا پروانہ اور شمع اور گل نے مجھ ہی سے سیکھا ۱۲

سمجھا اور غزوۂ احد میں ابوطلحہ صحابی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ڈھال لئے کھڑے تھے تاکہ حضور صلعم پر غنیم کا تیر نہ پڑے جب حضورؐ سر مبارک اٹھا کر دیکھتے تو وہ عرض کرتے :-

بابی انت وامی لاتشرف	یعنی آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں
یصیبک سھم نحری	آپ سر نہ اٹھائیے ایسا نہ ہو کہ آپ کو کوئی تیر آ لگے
دون نحرک	آپ کی جان سے پہلے میری جان ہے -

یہ ہے سچی محبت - اور ہجرت کے قصہ میں ہے کہ جس رات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کا ارادہ کیا تو کفار نے حضورؐ کے قتل کے لئے مکان کا محاصرہ کر رکھا تھا حضورؐ نے اپنی جگہ حضرت علیؓ کو لٹا دیا اور خود وہاں سے نکل گئے یہ بے تامل لیٹے رہے اور جان کی پروا نہ کی۔ اس قسم کے ہزاروں قصے صحابہؓ کے موجود ہیں پروانہ و شمع کا عشق زبان زد خاص و عام ہے لیکن اس کی صحابہؓ کے عشق کے سامنے کچھ بھی حقیقت نہیں دیکھئے ایک صحابی ہیں حضرت وحشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ انہوں نے قبل از اسلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہؓ کو شہید کیا تھا اور ان کے ساتھ طرح طرح کی زیادتی کی تھی اس کے بعد اسلام لائے ۔ ظاہر ہے کہ اسلام لانے سے پچھلے تمام گناہ محو ہو جاتے ہیں لیکن یہ حضور صلعم کے سامنے آتے تو حضورؐ کو اپنے چچا کے شہید ہونے کے تمام واقعات یاد آجاتے ان سے فرمایا کہ کیا تم ایسا کر سکتے

ہو کہ میرے سامنے نہ آؤ۔ بس وہ بےچون و چرا چل دیئے اور حمص علاقہ شام میں جا رہے اور کبھی دربارِ رسالت میں نہ آئے۔ ناظرین غور کریں کہ کسی عاشق سے یہ ہو سکتا ہے کہ محبوب سے جدائی اختیار کرے سب بلائیں سہ لے گا مگر یہ نہیں سہ سکتا یہ اس کے اختیار ہی سے باہر ہے اگر وہ ارادہ سے کرنا بھی چاہے تو اس کے ہاتھ پیر اس کے لئے کام نہ دیں گے۔

از فراقِ[۱] تلخ میگوئی سخن
ہرچہ خواہی کن ولیکن این مکن

لیکن حضرت وحشی نے محبوب کے اس حکم کی تعمیل بھی کر کے دکھا دی رضی اللہ تعالےٰ عنہ۔

اُرید وصالہ ویرید ھجری
فاترک ما ارید لما یرید

اسی کا ترجمہ ہے:-

میلِ[۲] من سوئے وصال و میلِ او سوئے فراق
ترکِ کامِ خود گرفتم تا برآید کامِ دوست

کیا پروانہ ایسا کر سکتا ہے کہ شمع پر نہ دوڑے اور اس سے الگ رہے ہرگز نہیں لیکن ایک صحابی نے یہ بھی کر دکھایا پھر محبت پروانہ کی بڑھی ہوئی ہے

---

[۱] تو فراق کی تلخ باتیں کرتا ہے خدارا یہ نہ کر اور جو چاہے سو کر ۱۲ [۲] میری خواہش وصال کی ہے اور وہ فراق چاہتا ہے۔ [illegible]

[illegible]

یا صحابی کی غرض دنیا میں کوئی نظیر نہیں پیش کر سکتا صحابہؓ کی محبت کی۔ اور عظمت
کی حالت یہ تھی جس کا ثبوت قرآن شریف سے ہے۔

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا

یعنی جس وقت کوئی سورت قرآن کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہ اترتی ہے تو منافقین ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اور اشارہ کرتے ہے کہتے ہیں کہ کوئی دیکھتا تو نہیں پھر وہ اٹھ کر چل دیتے ہیں۔

اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کی حالت بیان کی گئی ہے کہ صحابہ
وحی کے سننے میں ایسے محو ہوتے تھے کہ منافقین اٹھ کر چلے جاتے تھے اور
ان کو خبر نہ ہوتی تھی صحابہؓ خود فرماتے ہیں۔

کأن علی رؤوسنا الطیر — یعنی ہم حضور کی مجلس میں ایسے بیٹھتے تھے کہ گویا ہمارے سروں پر پرندہ بیٹھا ہوا ہے۔

بعض پرندے اس طرح پکڑے جاتے ہیں کہ پکڑنے والا چپ چاپ بیٹھ جاتا ہے
اور پرندہ سر پر آ بیٹھتا ہے اور وہ اس کو پکڑ لیتا ہے اس وقت اگر ذرا بھی
حرکت سر کو ہو جائے تو وہ پرندہ اڑ جاتا ہے حضور کی مجلس کی حالت اس طرح
بیان کی کہ ہم ایسے ساکت اور ہمہ تن محو ہو کر بیٹھتے تھے جیسے پرندہ کو پکڑنے والا
بیٹھتا ہے اور غزوہ حدیبیہ کا قصہ ہے کہ جب کفار مکہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور

صحابہؓ کو عمرہ کرنے کے لئے مکہ میں نہ جانے دیا حضورؐ نے مقام حدیبیہ میں قیام فرمایا
تو کفار کے سفیر حضورؐ کے پاس بات چیت کرنے کے لئے آئے دیکھا کہ صحابہؓ کی
یہ حالت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وضو کرتے ہیں یا تھوکتے ہیں یا ناک صاف
کرتے ہیں تو وضو کا پانی اور تھوک اور سنک زمین پہ نہیں گرنے پاتا صحابہ ہاتھوں پہ
لے لیتے ہیں اور بدن پر مل لیتے ہیں اس کا اثر یہ ہوا کہ سفیروں نے جا کر کہا کہ حضورؐ
کے ساتھ وہ لوگ ہیں کہ ان کی یہ حالت ہے تو اگر لڑائی ہوئی تو حضورؐ کے پسینہ
پر اپنا خون گرا دیں گے اس خبر سے کفار پر رعب چھا گیا۔ صحابہؓ کی محبت اور تعظیم
کی یہ حالت تھی اب ان کے بعد کے لوگوں کی یعنی تابعین اور تبع تابعین کی
حالت سنئے امام مالک صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدینہ طیبہ گئے جب پاخانہ کی
حاجت ہوئی تو شہر سے باہر گئے اور ایک جگہ بیٹھنا چاہا خیال ہوا کہ ممکن ہے کہ
یہاں حضورؐ کا قدم مبارک پڑا ہو بس وہاں نہ بیٹھ سکے اور آگے گئے وہاں بھی یہی
حالت ہوئی حتی کہ کئی میل نکل گئے اور قضاء حاجت نہ کر سکے اور جب امام مالک
صاحب سے کوئی فرمائش حدیث سننے کی کرتا تو اس کو بٹھا کے گھر میں جا کر غسل
کرتے اور اچھے کپڑے پہن کر خوشبو لگا کر آتے تب ایک حدیث سناتے۔ ایک مرتبہ
حدیث سناتے ہیں ایک بچھو نے آستین کے اندر تین بار کاٹا جس سے اس قدر
تکلیف ہوئی کہ اٹھ اٹھ جاتے تھے اور چہرہ کا رنگ بدل بدل جاتا تھا مگر حدیث
کو قطع نہیں کیا اور پورا کر کے کرتے کو اتارا لوگوں نے عرض کیا کہ بڑی تکلیف

ہوئی آپ نے فوراً کرتے کو کیوں نہ پھینک دیا فرمایا کہ میری ہمت نہ ہوئی کہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیچ میں قطع کروں۔ امام مالک صاحب تبع تابعی ہیں اس سے تابعین کی حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے حضرت اویس قرنی تابعی کا قصہ مشہور ہے (جس کی سند کی تحقیق نہیں) کہ جب انہوں نے سنا کہ جنگ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دندان مبارک شہید ہوا تھا تو اپنے سب دانت توڑ ڈالے اور فرمایا کہ جب میرے محبوب کا دانت ٹوٹا تو مجھے کیسے زیبا ہے کہ دانت صحیح سالم رہیں اور معلوم کونسا دانت ٹوٹا ہوگا لہذا سب توڑ ڈالے (اور بلا سند مانا جائے تو کچھ اس قصہ پر مدار نہیں) غرض صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کو اور سلف کو جو تعلق تعظیم و محبت کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا اس کی نظیر دنیا میں نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ارشاد موجود ہیں ایک یہ:-

نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِيْ فَحَفِظَهَا وَوَعَاهَا وَأَدَّاهَا كَمَا سَمِعَهَا	یعنی خوش رکھے اللہ اس بندہ کو جس نے میری کسی بات کو سنا پس اس کو یاد کیا اور خوب محفوظ کر لیا اور دوسروں کو ویسے ہی پہنچا دیا جیسے سنا تھا۔

اور دوسرا ارشاد یہ ہے:

مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا	یعنی جس شخص نے مجھ پر جان بوجھ کر [illegible]

فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ — غلط بات منسوب کی تو اپنا ٹھکانا دوزخ کو سمجھے۔

صحابہؓ کی یہ حالت تھی کہ حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک کوچہ میں گزرے تو ایک پختہ مکان نظر پڑا دریافت فرمایا کہ یہ مکان کس نے بنایا ہے کسی نے عرض کیا فلاں شخص نے بنایا ہے حضور خاموش ہو رہے وہ مجلس شریف میں حاضر ہوا اور سلام کیا تو حضورؐ نے جواب نہ دیا بس اس کی تو جان ہی نکل گئی اور حاضرین مجلس سے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ آج کوئی نئی بات ہوئی۔ لوگوں نے کہا کچھ نہیں سوا اس کے کہ تمہارے مکان پر گزرے تھے اور پوچھا تھا یہ مکان کس نے بنایا لوگوں نے تمہارا نام لیا۔ بس یہ سنتے ہی وہ شخص گیا اور اپنے بنائے مکان کو گروا دیا۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ ابھی یہ بات متعین اور متیقن بھی نہیں ہوئی تھی کہ یہ مکان ہی سبب ہے حضور کی کشیدگی کا اور وہ شخص حضور سے پوچھ بھی سکتا تھا مگر عاشق کے قلب کو اتنی تاب کہاں کہ محبوب کی نگاہ پھری ہوئی دیکھ سکے اور تحقیق و تفتیش کرتا پھرے جب صحابہؓ کی یہ حالت تھی کہ ایک احتمال پر بنا بنایا مکان گرا دیا تو صریح حکم کا اثر ان پر کیا کچھ ہو سکتا ہے اور صریح حکم دو موجود ہیں جو ابھی مذکور ہوئے ہیں ایک میں تو ترغیب ہے روایت حدیث کی اور اس کو یاد رکھنے اور صحیح روایت کرنے کی اور دوسرے میں ترہیب[1] ہے غلط روایت کرنے اور غلط ملط کرنے سے ان صریح دھمکیوں کے سننے کے بعد

---

[1] ڈرانا ۱۲

صحابی عاشق رسول پر جو اثر ہو سکتا ہے اس کو وہی شخص جان سکتا ہے جو عشق و محبت سے کچھ مس رکھتا ہو نہ وہ حدیث کو تمام عمر بھول سکتا ہے نہ اس میں خلط ملط کر سکتا ہے۔ ان کی حالت کو اپنے اوپر قیاس کرنا قیاس[1] الغائب علی الشاہد ہے ہم دیکھتے ہیں کہ کسی مسٹر صاحب کو اگر لاٹ صاحب تک رسائی ہو گئی اور لاٹ صاحب نے دو چار باتیں کہ لیں تو وہ باتیں ان کو مع الفاظ کے بلکہ مع لب و لہجہ کے تمام عمر محفوظ رہتی ہیں اور مزے لے لے کر اس کو نقل کیا کرتے ہیں وجہ یہی ہے کہ لاٹ صاحب کی عظمت مسٹر کے ذہن میں ہے اور جسکی عظمت ہوتی ہے اسکی ہر بات یاد رہتی ہے یہ لاٹ صاحب کی عظمت حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے سامنے کیا نسبت رکھتی ہے ان دونوں کے اقتران[2] لفظی سے بھی وحشت معلوم ہوتی ہے پھر صحابی حضور کے الفاظ کو کیسے بھول سکتا ہے یہی وجہ کہ حضرت ابوذر صحابی سے حضور نے ایک حدیث میں ان کے بار بار تعجب کے ساتھ پوچھنے کی وجہ سے یہ لفظ بھی فرمایا تھا علیٰ رغم انف ابی ذر جس کا حاصل یہ ہے کہ جیسے میں کہتا ہوں ایسا ہی ہوگا اگرچہ ابوذر کی ناک مٹی میں رگڑ جائے۔ یہ کلمہ گو نہ زجر کا ہے لیکن ابوذر جب کبھی اس حدیث کو روایت کرتے تو اس لفظ کو ضرور نقل کرتے اور مزے لے لے کر کہتے اور یہی وجہ ہے کہ بعض حدیثیں اپنی خاص کیفیات کے ساتھ نقل کی گئی ہیں مثلاً بعض مسلسل بالاولیۃ ہیں یعنی شروع میں جس راوی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حدیث کو سنا تھا تو یہ حدیث اول حدیث تھی جو انہوں نے حضور سے سنی اس کیفیت کو انہوں نے محفوظ رکھا اور اوس کو کسی

---

[1] غیر موجود کو موجود پر قیاس کرنا ۱۲ [2] حضور کی عظمت کے ساتھ لاٹ صاحب کی عظمت کا ذکر ۱۲

کے سامنے نقل کیا تو اسی طرح کہ یہی حدیث اول اول اس کو سنائی اور دیگر احادیث اس کے بعد سنائیں اور آج تک وہ حدیث اسی طرح نقل کی جاتی ہے اور بعض حدیثیں مسلسل بالضحک ہیں یعنی اس کو ارشاد فرماتے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنسی آئی تھی اس کو صحابی نے جب روایت کیا تو اسی طرح ہنس کر روایت کیا اور آج تک اسی طرح نقل کی جاتی ہے۔ اور بعض حدیثیں مسلسل بضرب الفخذ ہیں یعنی اس کو ارشاد فرماتے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سامع کی ران پر دست مبارک مارا تھا وہ حدیث آج تک اسی طرح نقل کی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ اس سے اس عظمت اور محبت کا پتہ چلتا ہے جو صحابہ اور تابعین اور سلف کے قلوب میں تھی۔ جو عظمت و محبت اللہ و رسول کی صحابہ کے قلوب میں تھی اسی کا عکس تابعین کے قلوب میں بھی تھا اور اسی کا عکس تبع تابعین کے قلوب میں تھا امام مالک صاحب تبع تابعی ہیں ان کی حالت اوپر بیان ہوئی کہ مدینہ طیبہ میں پاخانہ کے لئے نہ بیٹھ سکے اور حدیث کو بلا غسل کئے نہ روایت کرتے اکثر سلف کے حالات ایسے ہی ہیں۔ تین قرنوں کے متعلق حدیث میں تصدیق وارد ہے:۔

خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم — یعنی سب سے بہتر میرا زمانہ ہے اس کے بعد ان لوگوں کا زمانہ جو ان سے متصل ہیں اس کے بعد ان کا زمانہ جو ان کے متصل ہیں۔

اسی حدیث کی رو سے یہ تینوں قرن خیر القرون کہلاتے ہیں احادیث

۱۶۷۸۷

تیسرے قرن میں جمع کی گئیں۔ یہ تاریخی غلطی تھی کہ زمانہ فساد آنے سے پہلے حدیث
کی تدوین ہوگئی اب ان میں احتمالات نکالنا شیعہ غیر ناشی عن دلیل سے زیادہ
وقعت نہیں رکھتا جو کسی اہل عقل کے نزدیک قابل التفات نہیں حقیقت کی
بات یہ ہے کہ جو لوگ حدیثوں کے بحث ہونے میں کلام کرتے ہیں تواریخ کے
بڑے دلدادہ اور معتقد ہیں اور اس کے مطالعہ کو بہت ضروری کہتے ہیں اور
اس میں ان کو وہ شبہات نہیں ہوتے جو حدیث میں ہوتے ہیں حدیث بھی علم
تواریخ ہی ہے اگر نام سے وحشت ہے تو اس کا نام اسلامی تاریخ رکھا جا
سکتا ہے حدیث کو اور تاریخ کو کیا نسبت تاریخ کی روایتوں کا نہ کوئی صحیح قاعدہ
نہ سند موجود اور سند ہو بھی تو سند کے راویوں کے حالات نامعلوم غرض محض مجہول
در مجہول ہے اور فن حدیث کے لئے اصول حدیث ایک مستقل فن ہے اس کو
پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ روایت حدیث کے لئے کیسی کیسی سخت شرطیں ہیں اور
کیسے معقول قواعد اور اصول ہیں۔ اس باب میں زمانۂ حال کی تصنیف ایک چھوٹا
رسالہ خیر الاصول لاحادیث الرسول مصنفہ مولانا خیر محمد صاحب جالندھری قابل
ملاحظہ ہے۔ ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ محبت وہ چیز ہے کہ آدمی کو ہمہ تن متوجہ
کر لیتی ہے تمام قوتے محبوب کی طرف مائل ہو جانے کی وجہ سے محبوب کی ہر
ادا محب کے ذہن میں نقش کالحجر ہو جاتی ہے یہی حال عظمت کا ہے کہ اس سے
خوف پیدا ہو کر ہرگز اس چیز کو بھول نہیں سکتا۔ شیر کو دیکھ کر کوئی ڈر جاتا

ہے تو اس کو گھاس پھونس بھی شیریں معلوم ہوتا ہے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ شیر کو کبھی بھول جائے گا۔ اس کی وجہ شیر کی عظمت ہے۔ اور محبت صادق کا اثر تو اس سے بھی زیادہ ہے۔ غرض محبت و عظمت کے ہوتے ہوئے ضعف حافظہ نہیں رہتا الا لعارض[۱] تو جب صحابہ محبت و عظمت میں غایت درجہ کا کمال رکھتے تھے اسی طرح ان کے بعد تابعین اور تبع تابعین کی بھی یہی حالت تھی تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کو اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے ملفوظات و حالات یاد نہ رہیں خصوصاً جبکہ حضورؐ ہی کی ترغیب و ترہیب ان کے کان میں پڑ چکی ہو۔ علاوہ بریں عرب کا حافظہ دنیا کے نزدیک مسلم ہے اور تاریخ اس کی شاہد ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے سو شعر کا قصیدہ ایک دفعہ سن کر یاد کر لیا تھا بعض واقعات کو نقل کرتے وقت صحابی کہتے ہیں گویا کہ یہ واقعہ اس وقت میرے سامنے ہو رہا ہے۔ اسی کے قریب قریب صحابہ کے بعد کے لوگوں کی حالت تھی حتی کہ وہ زمانہ آیا کہ تدوین حدیث ہو گئی اس زمانہ میں علم دین کے چرچوں اور رغبت اور شوق اور حافظوں اور تدین اور ثقاہت اور عدالت کے حالات کتب تاریخ سے معلوم کئے جائیں تو حیرت ہو گی۔ امام بخاری ایک مجلس میں تشریف رکھتے تھے علماء حدیث جمع ہوئے امتحان کے لئے انہوں نے ایک سو حدیثیں الٹ پلٹ کر کے اور سب کی سندیں گڈ مڈ کر کے ان کے سامنے پڑھیں اور کہا بتاؤ ان میں کونسی حدیث ٹھیک ہے امام بخاری نے علی الترتیب ایک ایک کی غلطی نکالی پھر ایک ایک کو صحیح طور سے پڑھ کر سنا دیا۔

---

[۱] سوا اس کے کہ کوئی قوی وجہ پیش آئے ۱۲

اس طرح صحیح ہے امام ترمذیؒ اخیر عمر میں نابینا ہو گئے تھے اسی حالت میں
سفرِ حج کا اتفاق ہوا ایک موقع پر جمّال نے کہا کہ سر جھکا لیجئے اوپر ایک درخت
ہے آپ نے سر جھکا لیا۔ جب لوٹ کر آئے تو اسی موقع پر از خود سر جھکایا کسی نے
عرض کیا کہ حضرت سر کیوں جھکایا۔ فرمایا یہاں ایک درخت ہے جس کی شاخ سے
سر ٹکرانے کا اندیشہ تھا عرض کیا یہاں تو درخت نہیں بس آپ نے اونٹ
کو روکا اور اُتر گئے اور فرمایا کہ اگر میرے حافظہ میں اتنا ضعف آگیا ہے تو
میری روایت حدیث کیسے معتبر ہوگی تحقیق کیا گیا تو ثابت ہوا کہ ٹھیک اسی
موقع پر درخت تھا مگر اب کٹ چکا ہے اور محدثین کی احتیاط کی یہ حالت تھی
کہ صرف ایک دفعہ استاد سے حدیث کو سن کر قابلِ روایت نہیں سمجھ لیتے تھے
بلکہ کبھی کبھی اُستاد کا امتحان لیتے تھے اور بہت بہت زمانہ کے بعد اس حدیث
کے سننے کی پھر درخواست کرتے تھے اگر اُستاد نے اس وقت بالکل ان ہی
الفاظ کے ساتھ سنائی تو اس کو معتبر سمجھتے ورنہ اس کو ترک کر دیتے اور اس کے
بعد نہ صرف اس حدیث کو خارج کرتے بلکہ اس کی تمام روایتوں کو غیر معتبر قرار
دے دیتے اور اس اُستاد سے قطع تعلق کر دیتے اور بعض دفعہ جب اس
کا جھوٹ معلوم ہوتا تو اس کی نسبت دجال کذاب وغیرہ الفاظ استعمال کرتے تھے۔
ذرا کسی کے حافظہ میں فرق پاتے تو اس کی روایت کا اعتبار نہ کرتے اور
اس کو سیئی الحفظ کہتے۔ اور تدین اور ثقاہت کا حال اس زمانہ میں یہ تھا۔

قوت حافظہ ان کا ان کے واقعات کثیرہ سے جو متواتر المعنیٰ ہیں ثابت ہوتا
ہے چنانچہ حضرت ابن عباسؓ کا ستر شعر کے قصیدہ کو ایک بار سن کر یاد کر لینا
اور حضرت امام بخاریؒ کا ایک مجلس میں سو حدیثیں منقلب المتن والاسناد
کو سن کر ہر ایک کی تغلیط کے بعد ان سب کو بعینہٖ سنا دینا پھر ایک ایک کی
تصحیح کر دینا اور امام ترمذیؒ کا بحالت نابینائی ایک درخت کے نیچے گذر
کر سر جھکا لینا اور وجہ دریافت کرنے پر وہاں درخت ہونے کی خبر دینا

کہ فقہا و محدثین اور علماء میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو تہجد گزار متورع متقی عفیف یا حیا
یا مروت نہ ہو بہت لوگ ایسے تھے کہ رات بھر عبادت الٰہی میں گزارتے اور عشا کے
وضو سے فجر کی نماز پڑھتے حیا کی یہ حالت تھی کہ ان کا فتوی کتابوں میں موجود
ہے کہ جو شخص بازار میں کھاتا ہو یا راستہ میں پیشاب کرتا ہو تو اس کی شہادت
قاضی کے یہاں قابل قبول نہیں کیونکہ اس میں حیا نہیں ہے اور جس میں حیا
نہیں وہ جھوٹ بول دے یا جو کچھ بھی کر گزرے بعید نہیں۔ جس زمانہ میں اس
قسم کے رواج تھے اور شرم و حیا اس درجہ تھی اور مطلق العنانی اور آزادی نہ تھی
تو ظاہر ہے کہ محدثین و علماء بھی روایت میں کس قدر احتیاط کرتے ہوں گے کیونکہ
یہ خوف ہوگا کہ اگر ذرا سی غلطی ہو گئی تو ہماری روایت متروک ہو جائے گی۔ اور
دجال و کذاب اور خدا جانے کس کس لفظ سے ہمیشہ کے لئے یاد کیا جائے گا۔
افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے بھائی اپنے اسلاف کے علمی ذخیروں کو مطالعہ ہی

جو کہ اس وقت نہ تھا اور تحقیق سے اس خبر کا صحیح ثابت ہونا اور محدثین
کا اپنے شیوخ کے امتحان کے لئے گاہ گاہ احادیث کا اعادہ کرانا
اور ایک حرف کی کمی بیشی نہ نکلنا یہ سب سیر و تواریخ و اسماء الرجال
میں مذکور و مشہور ہے جو قوت حافظہ پر دلالت کرنے کے لئے کافی ہے
اسماء الرجال میں نظر کرنے سے سیئ الحافظہ رواۃ کی روایات کو صحیح سے
خارج کرنا کافی حجت ہے اس باب میں محدثین کی کاوش کی۔

نہیں کرتے اور کوٹھیوں اور بنگلوں میں پڑے ہوئے رجماً بالغیب جو منہ میں آتا
ہے ہانک دیتے ہیں کم سے کم سفرنامہ شبلی ہی کو پڑھ لیں تو معلوم ہو جائے کہ
سلف کے زمانہ میں علوم کے کیا چرچے تھے لکھا ہے اس وقت سب سے بڑا
کتب خانہ فرانس کے پاس ہے جس کا زیادہ حصہ وہ ہے جو اس کو دارالخلافہ
بغداد سے ہاتھ لگا ہے اور برابر اس میں اضافہ ہوتا رہا ہے اس وقت
اس میں پچاس لاکھ کتابیں ہیں جن میں سے تیس لاکھ کتابیں اہل اسلام کے زمانہ
ماضی کی تصنیف ہیں۔ سلف اہل اسلام نے علوم کی وہ تکمیل کی ہے کہ اس
کی نظیر اب تک کسی قوم میں نہیں مل سکتی جس علم کی طرف توجہ کی اس کو ایسے
کمال تک پہنچا دیا کہ اس سے آگے بڑھنا عادۃً ناممکن ہے خصوصاً فقہ اور حدیث
کو تو اس درجہ پر پہنچا دیا کہ اس کی نظیر کسی ملت و مذہب میں موجود نہیں
ان دونوں میں سے اصل حدیث ہے اور فقہ ان مسائل کے مجموعہ کا نام ہے

جو قرآن و حدیث سے مستنبط کئے گئے ہیں فقہ کی تکمیل کی یہ حد ہے کہ کوئی
عجیب سے عجیب واقعہ پیش نہیں آتا کہ اس کا حکم فقہ میں نہ نکل آئے اس کی
تکمیل موقوف ہے قرآن و حدیث کی تکمیل پر قرآن تو متواتر ہے (جس کی شہادت
بڑے بڑے ملحدوں نے بھی دی ہے) حدیث کی خدمت اور ترتیب و تنقیح میں
وہ ان تھک کوششیں کیں کہ غیر قومیں بھی اس کی معترف ہیں اور صرف ارشادات
نبوی ہی کو محفوظ نہیں کیا بلکہ اس کے لئے اس کے متعلقات کو بھی کمال تک
پہنچایا راویوں کے نام اور ان کے حالات ان کے مولد و مدفن و مسکن سب
کو مدون کیا حتیٰ کہ یہ ایک مستقل فن بن گیا جس کا نام فن اسماء الرجال ہے اس
میں ضخیم کتابیں موجود ہیں اور ساتھ ہی اس کے چونکہ قرون ثلثہ کے بعد زمانہ
فساد شروع ہو گیا اور کچھ خلط ملط ہونے لگا اس واسطے موضوع حدیث کو بھی
جمع کیا اس میں بھی مستقل کتابیں موجود ہیں ذرا فن تاریخ کے عاشق اصحاب
کسی وقت انصاف کے ساتھ غور کریں کہ تاریخ کی کوئی بات بھی ایسی ہے جس
کی سند قوی یا ضعیف مسلسل موجود ہو مگر اس پر کیسا یقین کیا جاتا ... ہے اور
حدیث کی ایک بات بھی ایسی نہیں جس کی سند اور اس کے متعلق جرح و تعدیل
نہ ہو اس کے ہر ہر راوی کا حال اسماء الرجال میں درج ہے اور الفاظ حدیث
میں اگر راوی کو کہیں شبہ بھی ہو گیا ہے تو وہ صاف کہتا ہے یہ لفظ تھا
یا یہ اور نیچے کا راوی کہتا ہے کہ یہ شک فلاں راوی کا ہے اور بعض بہت سی

حدیثوں کو کئی کئی سند سے روایت کیا ہے حتیٰ کہ ایک[۱] حدیث کو بائیس[۲۲] سندوں سے روایت کیا۔ کیسا ظلم اور ناانصافی اور ناحق شناسی ہے کہ تاریخ کی تمام باتوں کو بے سند مان لیا جائے اور حدیث کی تمام باتوں کو جن میں ایک بھی بے سند نہیں اور بعض باسناد کثیرہ ہیں غیر معتبر کہا جائے۔ حیرت ہے کہ غیر قوم[۲] محدثین کی خدمات اور ان کی کوششوں کی داد دیں اور فن حدیث کی جلالت قدر وعظمت کے معترف ہوں اور اہل اسلام ان کی خدمات کو بیکار اور ناجائز کہیں اور طرح طرح کے اشکال کریں اور ایک سرے سے تمام احادیث کو اعتبار سے خارج کریں اس وقت اتفاق سے ایک کتاب اسی موضوع پر ہمارے پاس آئی جس میں حدیث کا مطلقاً غیر معتبر ہونا اور ان کی تدوین کو ناجائز اور خلاف قرآن ثابت کیا ہے اور اس میں طرز کلام نہایت بیباکانہ ہے ہم اس پر بھی انشاء اللہ تعالےٰ نظر ڈالیں گے اس وقت صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ محدثین کے حالات کو اپنے حالات پر قیاس کرنا اور اس زمانہ کو اس زمانہ پر قیاس کرنا غلطی ہے اور حافظہ کے ایسا قوی ہونے کو کہ احادیث بلا لکھے یاد رہیں محال اور خلاف فطرت کہنا کوتاہ نظری ہے جس

۱؎ یہ حدیث بریرہ ہے جو بخاری میں ۲۲ جگہ آئی ہے اور ہر جگہ نئی سند سے ہے ۱۲

۲؎ ڈاکٹر اسپیر انگریز سابق پرنسپل مدرسہ کلکتہ اور سر ولیم میور اور گولڈ زیہر نے بڑی محنت وجانفشانی سے احادیث اسلام کا کافی ذخیرہ جمع کیا اور علوم متعلقہ احادیث پر بھی نظر ڈالی اور محدثین کی محنت وجانفشانی کی داد دی احادیث کے مستند ہونے کا اعتراف کیا دیکھو رسالہ معارف فروری ۳۳ء ۱۲

سے عشق ہوتا ہے یا اس کی عظمت دل میں ہوتی ہے اس کی بات ضعیف سے ضعیف حافظہ والا بھی نہیں بھولتا اور عرب کا حافظہ تو دنیا کے نزدیک مسلم ہے قریب کے زمانہ میں بھی ایسے لوگ ہوئے ہیں جن کے حافظہ کے حالات قابلِ تعجب ہیں فیضی ابوالفضل کے حالات تاریخ میں ہیں کہ ایک دفعہ سن کر بڑے سے بڑا قصیدہ یاد کر لیتے تھے۔ زمانۂ حال میں خود راقم نے بھی چند اشخاص ایسے دیکھے ہیں اگر ان کو خود نہ دیکھا ہوتا تو غالباً میں بھی یقین نہ کرتا۔ منجملہ ان کے حکیم عبدالمجید خاں صاحب دہلوی ہیں کہ ان کے یہاں ہزار بارہ سو مریضوں کا روزانہ اوسط تھا اور دو ڈھائی گھنٹہ سے زیادہ وقت مطب کا نہ تھا کسی مریض کو چند سکنڈ سے زیادہ وقت نہ ملتا تھا میرا زمانہ طالب علمی کا تھا از راہ شوخی ایک مرتبہ بہت بھیڑ میں گھس کر حکیم صاحب کے سامنے پہنچا دریافت فرمایا کیا تکلیف ہے۔ عرض کیا اکثر آشوبِ چشم رہا کرتا ہے نسخہ لکھوایا حکیم صاحب کے سامنے کھڑے ہوئے میں کچھ سیکنڈ سے زیادہ وقت نہیں لگا۔ ایک سال کے بعد پھر اسی طرح بھیڑ میں گھس کر حکیم صاحب کے سامنے پہنچا نظر پڑتے ہی پوچھا اب آنکھیں کیسی رہتی ہیں۔ اور منجملہ ان کے مولانا حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوری ہیں حکیم صاحب وقت کے بڑے پابند تھے ایک وقت اخبار دیکھنے کا بھی مقرر تھا روزانہ اخبار دیکھتے تھے حالت یہ تھی کہ کسی اخبار کے متعلق پوچھئے کہ سال گزشتہ میں فلاں مضمون اس میں چھپا تھا تو حکیم صاحب کو تقریباً ایک صفحہ یاد ہوگا۔ اور حکیم صاحب نے

ابطال اصول الشیعہ ایک کتاب لکھی ہے اس میں تاریخی واقعات بکثرت ہیں کسی نے عرض کیا کہ جناب کے پاس کتابیں تو ہیں نہیں یہ واقعات کہاں سے نقل کئے ہیں فرمایا کتابوں کی کیا ضرورت ہے یہ واقعات میں نے زمانۂ طالب علمی میں ریاست رام پور میں نواب صاحب کے کتب خانہ میں کتابوں میں دیکھے تھے۔ اس کو عرصہ پچاس سال کا ہوا ہوگا۔ اس کی خبر جانسٹھ ضلع مظفر نگر کے شیعہ صاحبان کو پہنچ گئی سب نے جمع ہو کر کتابوں سے مقابلہ کیا اس خیال سے کہ اگر ایک واقعہ میں بھی غلطی نکل آئے تو تمام کتابوں کو مشتبہ کیا جا سکتا ہے لیکن کہیں غلطی نہیں نکال سکے اور منجملہ ان کے امیر شاہ خاں صاحب تھے جن کا ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ انتقال ہو گیا ہے وہ ریاست بھنڈھو ضلع علی گڑھ میں رہا کرتے تھے غدر ۵۷ء سے پہلے کے بڑے بڑے حضرات کے دیکھنے والے تھے جیسے مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی. نواب قطب الدین خاں صاحب مرزا غالب شاعر، حضرت شاہ عبد العزیز صاحب حضرت شاہ عبد القادر صاحب حضرت شاہ رفیع الدین صاحب حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس اسرارہم ان حضرات کے حالات بیان فرماتے اور ان کے ملفوظات نقل فرماتے تو جگہ اور وقت اور حضار مجلس سب کا ذکر کرتے اور ایک واقعہ کو دس دفعہ بھی نقل کرتے تو کسی لفظ کا فرق نہ ہوتا بعض قدردانوں نے یہ دیکھ کر کہ خاں صاحب کا اخیر وقت ہے یہ ملفوظات خاں صاحب کے ساتھ ہی خاک میں نہ چلے جائیں

اور علاوہ قوت حافظہ کے چونکہ اللہ تعالیٰ کو ان سے یہ کام لینا
تھا اس لئے غیبی طور پر بھی اس مادہ میں ان کی تائید کی
گئی تھی

جہاں تک ہوسکا خانصاحب کے پاس بیٹھ کر ان ملفوظات اور واقعات کو جمع کیا اب وہ ذخیرہ چھپ بھی گیا ہے نام اس کا امیر الروایات ہے اس کو پڑھنے سے ابنائے زماں کے اس خیال کی بالکل تردید ہوتی ہے کہ ایسا حافظہ کہ پچاس سال تک کی بات بلا لکھے یاد رہے خلاف فطرت ہے خانصاحب عالم نہ تھے لیکن عبارتیں عربی کی اور فارسی کی اور اصطلاحی الفاظ جس سے جیسے سنے تھے بے تکلف نقل کرتے تھے امیر الروایات کے دیکھنے سے اس کی تصدیق ہوسکتی ہے ایسے ہی اور بہت سے ہوں گے یہاں صرف چند اشخاص کا ذکر کیا گیا غرض یہ خیال غلط ہے کہ ایسا حافظہ ہونا کہ بلا لکھے یاد رہے خلاف فطرت ہے تو یہ وجہ انکار حدیث کی ناقابل تسلیم ہے اور یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قطع نظر اس سے کہ سلف کا حافظہ ایسا قوی تھا چونکہ حق تعالیٰ کو اپنے دین کی حفاظت منظور تھی اس لئے غیبی طور پر بھی اس کام میں ان کی تائید کی گئی تھی غیبی طور پر مراد وہ طریقے ہیں جو اسباب ظاہری کے علاوہ ہوں جن میں سے ایک کو حضرت ماتن مدظلہ نے بطور تمثیل بیان فرمایا ہے کہ حضرت ابوہریرہ کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ پڑھ کر چادر میں دم کر دیا وہ چادر انہوں نے سینہ سے لگائی اس کے بعد وہ کچھ

نہیں ہو سکتے تھے (یہ اصحاب صفّہ میں سے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی طلب علم کے لئے وقف کر دی تھی دن رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات یاد کرنے میں رہتے تھے) اس پر ہمارے بھائی تعجب ضرور کریں گے کیونکہ ان کی نظر اسباب ظاہری تک رہتی ہے اکثر ایسے موقعوں پر کہنے لگتے ہیں کہ دنیا میں ہر کام سبب سے ہوتا ہے اور جتنا سبب ہوا اتنا ہی کام ہو سکتا ہے مثلاً ایک راستہ سو میل کا ہے اور ریل کی رفتار بیس میل فی گھنٹہ ہے تو ریل پانچ ہی گھنٹہ میں اس راستہ کو طے کر سکے گی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بجائے پانچ گھنٹہ کے چار گھنٹہ میں طے کر لے۔ حافظہ انسانی جتنا کام کر سکتا ہے اتنا ہی کرے گا کیا تائید غیبی سے یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے زیادہ کام کرنے لگے اگر ایسا ہو سکتا ہے تو دنیا میں لکھنے پڑھنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ ہر کام سبب سے ہوتا ہے بلکہ قادر مطلق کی قدرت سے ہوتا ہے حق یہ ہے کہ سبب کی آڑ میں بھی قدرت ہی کام کرتی ہے ظاہر بات ہے کہ سبب کے لئے بھی سبب ہوتا ہے اور اس سبب کے لئے بھی سبب ہوتا ہے حتیٰ کہ کہیں نہ کہیں اسباب کا سلسلہ ختم کرنا اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ سبب اول کا وجود صرف قدرت سے ہوا تو ثابت ہو گیا کہ کوئی چیز بلا سبب کے بھی محض قدرت سے موجود ہو سکتی ہے تو اگر یہ چیز بھی جو اسباب کے سلسلہ کے اخیر میں ہے اور بہت سے سببوں کے بعد پیدا ہوتی ہے کبھی بلا سبب کے پیدا ہو جائے

چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ کا قصہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے چادر میں کچھ کلمات پڑھ دیئے اور انہوں نے وہ چادر اپنے سینہ سے لگا لیا حدیث میں وارد ہے

جس طرح وہ چیز ہمیشہ پیدا ہوتی ہے جو اسباب کے سلسلہ کے اول میں ہوتی ہے تو کیا استحالہ لازم آتا ہے اسی قبیل سے یہ ہے کہ دین کی حفاظت کے لئے حق تعالیٰ نے حاملان دین کو حافظہ ایسا قوی دیدیا جس سے انہوں نے ارشادات نبوی کو بکمال وتمام محفوظ رکھا گو یہ تعجب کی بات ہے مگر محال نہیں کیونکہ اس کے استحالہ پر کوئی دلیل عقلی نہیں بلکہ زیادہ تعجب کی بات بھی نہیں دیکھئے کاغذ پر لکھی ہوئی بات صدہا سال تک محفوظ رہتی ہے اور سائنس کی تحقیق ہے کہ دماغ میں بھی ہر چیز منقش ہوتی ہے اور ایسا ریکارڈ تیار ہوتا ہے جیسے گرامو فون کا ریکارڈ ہوتا ہے حتیٰ کہ یہ کوشش کی جارہی ہے کہ مرتے وقت آدمی کے دماغ میں سے تمام ریکارڈ نکال لئے جائیں اور ان کو کسی دوسرے انسان کے دماغ میں اتار دیا جائے تاکہ اس کے تمام عمر کے محفوظات سب ایکدم اس کے دماغ میں اتر آئیں اور ضائع نہ ہوں اس اتارنے کے لئے دو سال کی مدت بھی تجویز ہو چکی ہے اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جو بات ایک دفعہ دماغ میں آگئی اگر کوئی امر دماغ کو مشوش کرنے والا پیش نہ آئے تو وہ محو نہیں ہو سکتی جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ جس کو اطمینان قلب حاصل ہو اس کا حافظہ بہت قوی ہوگا اور اطمینان قلب ذکر اللہ سے اور زہد فی الدنیا سے حاصل ہوتا ہے اور دنیا کو معلوم ہے

لہ محال ہونا ۱۲

کہ سلف ان دونوں باتوں میں کس درجہ کمال رکھتے تھے لہذا ان کے حافظوں کا قوی ہونا کچھ تعجب کی بات بھی نہیں اور اگر قابلِ تعجب ہو بھی تو محال تو نہیں اور جب کہ وہ محال نہیں تو درحالیکہ واقعات سے اس کا ثبوت ہوتا ہے تو اس کے انکار کی کیسے گنجائش ہو سکتی ہے اور ریل کی مثال جو ابھی گذری نا تمام ہے اس واسطے کہ بیس میل فی گھنٹہ کی چال جو قرار دی گئی وہ چال معتاد ہے یعنی یہ وہ چال ہے کہ جس سے ریل چلائی جاتی ہے ورنہ انجن میں طاقت اس سے زیادہ چالیس پچاس میل فی گھنٹہ تک کی ہوتی ہے تو اگر کبھی پانچ گھنٹہ کی مسافت کو رفتار بڑھا کر چار گھنٹہ میں طے کیا گیا تو کیا استحالہ ہو گیا حق تعالے نے انسانی دماغوں میں بطریق عادت ایک خاص حد تک طاقت دی ہے جس سے بطریق معتاد کام کر سکتے ہیں لیکن اگر کبھی طاقت بڑھا دی جائے تو زیادہ کام کیوں نہیں کر سکتے جس خدا کا دین ہے اس نے دین کی حفاظت کے لئے دماغوں میں طاقت بڑھا دی تو کیا محذور لازم آگیا اور ایسا ہونا خواہ بلا واسطہ منجانب اللہ ہو یا کسی کی دعا کی برکت سے یا کسی کے تصرف سے ہو تو عقل سلیم کے نزدیک کسی طرح ناممکن نہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہ کی چادر پر کچھ پڑھ دیا اور اس کا اثر یہ ہوا کہ ان کا حافظہ بڑھ گیا تو کیا تعجب کی بات ہے۔ اسی طرح پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام حاملانِ دین کے لئے دعا کی :-

نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ   اللہ تعالیٰ خوش رکھے اس شخص کو جس نے میری بات (حدیث) سنی

ازالۃ الاوہام ۱۲

مَقَالَتِیْ فَحَفِظَهَا وَوَعَاهَا — اور اسے محفوظ رکھا اور خوب ذہن نشین کر

وَاَدَّاهَا کَمَا سَمِعَهَا — لیا اور دوسروں تک جیسا سنا تھا پہنچا دیا

جیساکہ اوپر گزرا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ دل سے چاہتے تھے کہ احادیث محفوظ ہوں اور حق تعالےٰ اپنے بندگانِ خاص کی تمنّا پوری فرماتے ہیں ؎

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں[1]
می دہد یزداں مرادِ متقین

بنابریں حق تعالےٰ نے غیب سے تائید فرمائی اور حافظوں میں قوت معتاد سے زیادہ عطا فرمادی تو کیا تعجب ہے ایک نماز و دعا بھی حافظہ کی قوت کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائی ہے جو کتب احادیث میں موجود ہے اور مناجات مقبول کے تتمہ میں بھی درج ہے اس کی نسبت راقم کا اور بہت سے لوگوں کا تجربہ ہے کہ بہت زیادہ موثر ہے بعض لوگوں نے اس کو پڑھ کر دو مہینہ میں کل قرآن شریف یاد کر لیا ہے یہ سب تائید غیبی ہے۔ اور تائید غیبی کا ایک اور بھی طریقہ ہے جس کو ہمارے نئے تعلیم یافتہ بھائی بہت آسانی سے سمجھ سکتے۔ وہ یہ ہے کہ جیسے اسباب ہر چیز کے وجود میں داخل رکھتے ہیں اسی طرح موانع بھی اس چیز کے انعدام میں دخل رکھتے ہیں مثلاً ایک شخص تجارت کرتا ہے تجارت افزائش مال کا سبب ہے فرض کرو کہ اتفاق سے بارش زیادہ ہوئی اور اس کا سامان

---

[1] جو تم چاہو خدا تعالیٰ وہی کر دیتا ہے کیوں کہ خدا تعالیٰ متقیوں کی مراد پوری فرما دیتے ہیں ۱۲

تجارت خراب ہوگیا یا غرق ہوگیا تو باوجود سبب افزائش موجود ہونے کے ایک مانع پیدا ہوگیا اور افزائش مال نہ ہوسکی تائید غیبی اس صورت میں یہ ہوسکتی ہے کہ اسباب افزائش موجود ہوں اور موانع نہ پیدا ہوں دنیا میں جس کو ترقی ہوتی ہے اسی طرح ہوتی ہے کہ کوئی سبب ترقی کا موجود ہوجاتا ہے اور کوئی مانع ترقی کا پیش نہیں آتا پس ترقی ہوجاتی ہے اور جو زیادہ ترقی مقدر ہوتی ہے تو بہت سے اسباب ترقی کے جمع ہوجاتے ہیں اور مانع ایک بھی پیش نہیں آتا۔ یہ تائید غیبی ہے اس کے غیبی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ بندہ کے اختیار سے خارج ہے۔ دیکھا ہوگا کہ اس وقت بعض لوگ ایسے موجود ہیں کہ ایک وقت میں مفلس قلاش تھے اور اس وقت لکھ پتی ہیں صورت یہ ہوئی کہ چار پیسہ کا سودا لے کر بیٹھے تھے اور ترقی شروع ہوئی حتیٰ کہ لکھ پتی ہوگئے۔ اس ترقی کے اسباب کے سلسلہ کا ہر ایک جزو تو اختیاری معلوم ہوتا ہے لیکن مجموعہ غیر اختیاری ہے دلیل یہ ہے کہ اگر دوسرا کوئی شخص چاہے کہ اسی طرح ترقی کرلے تو نہیں کرسکتا وجہ یہی ہے کہ ہر ایک سبب تو اختیاری ہے لیکن ان کا جمع ہونا اور موانع کا پیش نہ آنا یہ اختیاری نہیں اس اجتماع اسباب و عدم موانع کا نام تائید غیبی ہے اب سمجھئے کہ حق تعالیٰ کو دین کی حفاظت منظور تھی اس کے لئے اتنے اسباب جمع فرمائے حاملان و ناقلان دین کا شوق و رغبت و شغف قوت حافظہ اطمینان قلب زہد عن الدنیا وغیرہ۔ شوق و رغبت اور قوت حافظہ کا

حال اوپر بیان ہوا۔ اطمینان قلب کی نسبت بھی ہمارا دعویٰ ہے کہ جتنا اہل اسلام
کو میسر ہے اتنا کسی دوسری قوم کو میسر نہیں ہو سکتا اس واسطے کہ اطمینان قلب
توحید اور ذکر اللہ سے اور صبر و توکل و رضا بالقدر سے پیدا ہوتا ہے ان باتوں
میں کوئی دوسری قوم اہل اسلام کے سامنے نہیں آسکتی دیگر اقوام کی شہادتیں
اس بارہ میں موجود ہیں مخالفین سلف کے حالات میں لکھتے ہیں کہ سچے خدا
کے بندے اور خدا کو ماننے والے وہی تھے ان کو خدا کے کسی کام میں
کوئی چیز مانع نہیں ہوتی تھی لشکریوں کی یہ حالت تھی کہ امیر الجیش کا حکم
سننے کے بعد ان کو رسد وغیرہ تیار کرنے کا بھی انتظار نہ ہوتا تھا بس خدا پر
توکل کر کے چل دیتے تھے اگر کہیں کھانے کو نہ رہا تو اپنے گھوڑے کی
زین میں سے چمڑا کاٹ کر اُبال کر کھا لیا اور بس۔ زہد عن الدنیا کی حالت وہ تھی
جس کو دنیا جانتی ہے بعض حضرات کا فتویٰ یہ تھا کہ ایک پیسہ بچا کر رکھنا جائز
نہیں شام کو جو کچھ خرچ سے بچا خیرات کر دیا حضرت ابوبکرؓ خلیفۂ اول سے
بحالت خلافت گھر والوں نے حلوے کی درخواست کی آپ نے فرمایا میرے
پاس اتنا پیسہ نہیں ہے گھر والوں نے روزینے میں سے کچھ نہ کچھ کاٹ کر ہفتہ دو ہفتہ
میں چند پیسے جمع کر کے حلوا پکایا اور حضرت کے سامنے بھی رکھ دیا پوچھا کہاں
سے آیا گھر والوں نے صورت واقعہ بیان کی کہ ہم نے اتنے دنوں پیٹ کاٹ کر
پیسے جمع کر کے یہ حلوا پکایا ہے فرمایا اس سے ثابت ہوا کہ جو روزینہ بیت المال

سے ملتا ہے وہ پیٹ سے زیادہ ہے لہذا گزشتہ اتنی رقم واپس کرو اور آئندہ کے لئے کم کرو جن کی زندگی اتنی سادی ہو ان کے یہاں علائق دنیا نہ ہوں گے پھر صبر و توکل اور رضا بالقضا بھی بدرجۂ کمال ہوتا ان کے دماغ و قلب کو تشویش سے کیا واسطہ اسی کا نام اطمینان ہے اور اطمینان والے کا حافظہ ہمیشہ قوی ہوتا ہے کیونکہ جو ریکارڈ دماغ میں تیار ہوتا ہے اس کو محو کرنے والی چیز کوئی موجود نہیں کیونکہ سوائے ذات واحد کے ان کو کسی سے تعلق ہی نہیں نہ ان کا دل کسی چیز سے ڈرتا ہے پھر وہ جو کام بھی کریں بہ وجہ اکمل کر سکتے ہیں غرض سلف میں تمام سامان ترقی دین کے حق تعالےٰ نے جمع فرما دیئے تھے اور تمام موانع کو مرتفع فرما دیا تھا اس سے حفاظت اور ترقی دین کی خاطر خواہ ہوئی ۔ یہ بات کسی اور مذہب کو نصیب نہیں ہوئی ۔ حیرت کی بات ہے کہ جس زمانہ میں نہ آلات اشاعت موجود تھے نہ سفر کرنا آسان نہ تبادلۂ خیالات کے ذرائع تھے مگر اہل اسلام کی تصانیف اس وقت کی ایسی ایسی اور اس تعداد میں موجود ہیں کہ ان کا جواب نہیں ہو سکتا یہ نتیجہ سوائے تائید غیبی کے کس چیز کا ہے ۔ حضرت مصنف مدظلہ نے حدیث کے متعلق شرح و بسط کے ساتھ کلام فرمایا ہے کیونکہ حدیث منجملہ اصول دین کے ایک بڑی اصل ہے اسی بنا پر حضرت ابوہریرہؓ کا قصہ چادر کو سینہ سے لگانے اور اس سے حافظہ بڑھ جانے کا بیان فرما کر اس کے متعلق کچھ شبہات کو بھی حل فرماتے ہیں

اور اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ خود حدیث ہی میں کلام ہو رہا ہے اور
پھر حدیث ہی سے استدلال کیا جاتا ہے اصل یہ ہے کہ کلام تو احکام
کی حدیثوں میں ہے اور یہ تو ایک قصہ ہے ایسی احادیث قسم میں علم تاریخ
کی جو بلا اختلاف محتج بہ (قابل حجت ۱۲) ہے۔ اور اگر اس قصہ پر خلاف فطرت ہونے
کا شبہ ہو تو اس کا جواب انتباہ سوم بحث معجزہ میں ہو چکا ہے۔ پھر خود

ایک شبہ یہ ہے کہ یہ قصہ بھی کتب حدیث سے ہی نقل کیا گیا ہے اور حدیث
ہی کے قابل حجت ہونے میں کلام ہو رہا ہے تو اس کے بھی صحت میں کلام
ہوا۔ جواب یہ ہے کہ یہ تو ایک واقعہ کی حکایت ہے جو از جنس تاریخی مضامین
کے ہے اور تاریخ سب کے نزدیک قابل حجت ہے۔ دوسرا شبہ یہ ہے کہ
یہ واقعہ خلاف فطرت ہے لہذا درایۃً قابل قبول نہیں۔ اس کا جواب انتباہ سوم
میں معجزات کی بحث میں گزر چکا ہم اس کو مختصراً یہاں بھی نقل کرتے ہیں تاکہ ہمارے
بھائیوں کو ورق گردانی کی تکلیف نہ اٹھانی پڑے وہ یہ ہے کہ ایسے امور محال
نہیں مستبعد ہیں کیونکہ محال اس کو کہتے ہیں جس کے نہ ہو سکنے پر دلیل عقلی
قائم ہو جیسے دن اور رات کا ایک جگہ جمع ہو جانا اور مستبعد وہ ہے جو عادت
کے خلاف ہو لیکن کوئی عقلی دلیل اس کے نہ ہو سکنے پر قائم نہ ہو جیسے چاند میں
جانا یا زمین کا متحرک ہونا وغیرہ۔ محال کے وجود کی خبر کی ہمیشہ تکذیب کی جائے
گی اور مستبعد کے وجود کی خبر قابل تعجب ضرور ہو گی لیکن اگر خبر دینے والے

ہم کو اس میں بھی کلام ہے کہ یہ خلافِ فطرت ہے اہلِ سحر بزعم معمول کے متخیلہ میں ایسے تصرفات کر دیتے ہیں جن سے اشیاء غیر معلوم منکشف اور اشیاء معلومہ غائب و نظروں سے مخفی ہو جاتے ہیں۔

کی سچائی کسی طرح ثابت ہو جائے تو تکذیب نہیں کی جائے گی جیسے آج کل کے سائنس داں زمین کی حرکت کے قائل ہیں جو بہت سے آدمیوں کے نزدیک قابلِ تعجب بات ہے کیونکہ اتنا بڑا جسم بلا کسی چیز پر ٹکے ہوئے اس خوبی سے حرکت کرے کہ کوئی بے قاعدگی اس میں نہ ہونے پائے سمجھ میں آنا مشکل ہے لیکن سائنس دانوں کی بہت سی باتیں سچی پائی ہیں اس وجہ سے اس کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے اور اسی بنا پر چاند میں جانے کی جھوٹی سچی خبر کی بھی تکذیب نہیں کی جاتی صرف تعجب کر کے رہ جاتے ہیں۔ بنا بریں کہا جاتا ہے کہ چادر میں کچھ پڑھ دینے سے اور اس کے سینہ میں لگانے سے حافظہ کا قوی ہو جانا مستبعد ہے مگر محال نہیں پس جب کہ اس کی خبر معتبر سند سے ملی ہو تو اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ قطع نظر حدیث سے تاریخ میں ایسے صدہا واقعات منقول ہیں جو اب کسی طرح سمجھ میں نہیں آتے مگر ان کو تسلیم کیا جاتا ہے جیسے جامِ جمشید، ماہِ نخشب، شہر بعلبک کے دروازہ پر دو بتوں کا ہونا ان میں سے ایک میں سے طلوعِ آفتاب کے وقت اور دوسرے میں سے غروبِ آفتاب کے وقت گانے کی آواز آتی تھی۔ اسلامی

اس سے یہ مقصود نہیں کہ آپ کا یہ تصرف اسی قبیل کا تھا بلکہ صرف
یہ بتلانا ہے کہ خلاف فطرت کہنا مطلقاً صحیح نہیں - اور علاوہ اس کے
ہم نے خود اپنے زمانہ کے قریب ایسے حافظ کے لوگ سنے ہیں

فتوحات کے زمانہ میں ایک روپیہ ہاتھ لگا تھا جس میں یہ طلسم تھا کہ ترازو کے
ایک پلہ میں وہ رکھا جائے اور ایک میں کوئی اور چیز تو روپیہ ہی کا پلہ جھکتا
تھا خواہ دوسری چیز کتنی ہی وزنی ہو - اور زمانۂ قریب ہی میں دہلی کے قلعہ میں
گرم حوض کا ہونا - اور اسی قسم کے بہت سے طلسمات جو کتابوں میں درج ہیں -
ان سے تعجب کیا جاتا ہے مگر انکار نہیں کیا جاتا حالانکہ تاریخ میں ان کی
نقل سند معتبر کے ساتھ بھی نہیں پھر حضرت ابوہریرہ کے واقعہ کا انکار باوجود
سند صحیح اور معتبر ہونے کے کیوں کیا جاتا ہے بس یہ کہہ سکتے ہیں کہ قابل تعجب
بات ہے لیکن وقوع میں آئی - اور حضرت مصنف مدظلہ نے تو اس تعجب
کو بھی رفع فرما دیا اس طرح کہ تعجب اس چیز سے ہوا کرتا ہے جس کو دیکھا نہ ہو
گراموفون کو جب تک دیکھا نہ تھا بڑا تعجب تھا لیکن اب کسی کو بھی تعجب نہیں
ہوتا۔ علیٰ ہذا ریل - تار - ہوائی جہاز وغیرہ سب کی حالت یہی ہے حضرت
ابوہریرہ رضؓ کے واقعہ کے متعلق بھی تعجب جب ہونا چاہیئے کہ اس کی نظیر مشاہدہ
میں نہ آئی ہو حالانکہ مشاہدہ میں آچکی ؛ چنانچہ مسمریزم کے عامل اسی قسم کے تصرفات
انسان کے دماغ پر کرتے ہیں مثلاً کسی کے دماغ میں یہ اثر پیدا کر دیتے ہیں کہ

چنانچہ حافظ رحمت اللہ صاحب الہ آبادی کے حافظہ کے واقعات
دیکھنے والوں سے میں خود ملا ہوں اور حکایتیں سنی ہیں - یہ تو حافظہ
کی کیفیت ہوئی۔ اور رغبت ان کی یاد رکھ کر بعینہ پہنچانے میں اس

جو چیز غائب ہو وہ اس کو نظر آجاتی ہے اس کے واسطے ناسمجھ بچہ کو معمول بناتے ہیں اور برائے نام ایک انگوٹھی سامنے رکھ دیتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں کیا نظر آتا ہے بسا اوقات اس کو وہ چیز نظر آجاتی ہے جس کو دیکھنا مقصود ہے - عامل لوگ اس انگوٹھی کو بیچنے کے لئے اس کو کراماتی انگوٹھی یا طلسمی انگوٹھی وغیرہ نام رکھتے ہیں اور بہت بہت قیمت حاصل کرتے ہیں اور کہتے ہیں اس میں روحیں حاضر ہوتی ہیں حالانکہ اس میں نہ روحیں ہیں نہ فرشتے نہ کچھ اور صرف چند روز مشق کرنے سے عامل کے اندر یہ تصرف پیدا ہوگیا ہے کہ معمول کے متخیلہ میں ایک قوت پیدا کر دیتا ہے جس سے اس کو وہ چیز نظر آجاتی ہے اسی واسطے بچہ پر عمل کرتے ہیں کیونکہ وہ خالی الذہن ہوتا ہے نیز اس کا دماغ بوجہ کثرت رطوبت کے انفعال کی قابلیت زیادہ رکھتا ہے اور بڑے آدمی کو معمول نہیں بناتے خصوصاً اس شخص کو جو اس قسم کے تصرفات کا خود بھی عامل ہو یا ان کا قطعاً منکر ہو کیونکہ خود عامل ہونے سے انفعال کی قابلیت کم ہو جاتی ہے اور منکر ہونے سے عدم انفعال کی قوت بلکہ مدافعت کی قوت پیدا ہو جاتی ہے - اور کبھی اس کے خلاف تصرف کرتے ہیں وہ یہ

لئے تھی کہ جناب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کو دعا دی ہے:-

بقولہ نَضَّرَ اللّٰہُ امرأً سَمِعَ	اللہ تعالٰی خوش رکھے اس شخص کو جس نے
مَقَالَتِیْ فَحَفِظَھَا وَوَعَاھَا	میری بات (حدیث) سُنی پس اس کو یاد کر لیا اور
وَاَدَّاھَا کَمَا سَمِعَھَا	محفوظ رکھا اور اس کو دوسرے تک جیسا
(الحدیث)	سنا تھا پہنچا دیا۔

اس دعا کے لینے کی وہ حضرات نہایت کوشش کرتے تھے کہ حتی الامکان
کہ یاد شدہ چیزوں کو ذہن سے غائب کر دیتے ہیں۔ جب اس قسم کے تصرفات بارہا دیکھے لئے تو اب قصہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے متعلق تعجب کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے اس کو خلافِ فطرت کیسے کہا جاسکتا ہے۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فعل بھی مسمریزم کی قوت سے تھا بلکہ صرف تقریب الی الفہم کے لئے مثال پیش کی گئی ہے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب یہ اثر ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں خواہ وہ کسی قوت سے ہو تو تعجب کی کیا بات ہے اور وہ خلافِ فطرت کیسے ہوا اور اگر بالفرض والتقدیر اس کا خلافِ فطرت ہونا تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی انکار کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ خبر صحیح سے ثابت ہے کہ یہ واقعہ ہوا اس کا ہونا بطور معجزہ ہے معجزہ اسی فعل کو کہتے ہیں جو خلاف عادت ہونے کی وجہ سے مستبعد ہو مگر عقلاً ممکن ہو اور یہ واقعہ ایسا ہی ہے۔ معجزہ کی

بحث انتباہ سوم میں مفصل گزر چکی اور ابھی ہم اوپر اجمالاً ذکر کر آئے ہیں معجزہ خدا کے تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو بلا واسطہ اسباب کے بندہ کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے موٹی بات ہے کہ جب صرف قوت خیالیہ سے ایسا ہو سکتا ہے تو قوت الٰہیہ سے کیوں نہیں ہو سکتا۔ غرض تاریخی واقعات سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کو علم حدیث کی حفاظت منظور تھی اس لئے اس کے اسباب بدرجۂ تمام و کمال جمع فرما دئے محدثین کو حافظے ایسے ہی دئے شوق و رغبت ایسی دی کہ اس کو عشق کا درجہ کہنا چاہیئے حدیث خلط ملط کرنے سے خوف ایسا دیا کہ موت کا خوف بھی اس کے سامنے کوئی چیز نہیں بعض موقعوں پر غیبی تائید فرمائی جو از قبیل معجزہ ہے پھر حدیث کے حجت ہونے میں شبہات نکالنا بالکل بے عقلی ہے خصوصاً ان لوگوں سے جو علم تاریخ کے دلدادہ ہیں کہ نہ اس کے راویوں کا پتہ نہ ان کے حافظوں پر وثوق نہ اُن کو اتنا شغف تھا نہ احتیاط تھی نہ غیبی تائید کا ثبوت بلکہ اس میں ناقلین کی بد دیانتی اور تراش خراش اور حق پوشی اور تعصب اور رائے زنی اس درجہ پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ کوئی تاریخ داں اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ پھر کس قدر حیرت ہے کہ تاریخ کو معتبر کہا جاوے اور حدیث کو نامعتبر۔ ع

ہمہ[1] پیش تو از دست تو مےخواہم داد

غرض فن تاریخ سے ثابت ہے کہ علم حدیث کے محفوظ رہنے کے جس قدر سامان درکار تھے سب سلف میں جمع تھے مثلاً حافظوں کا قوی ہونا۔ شوق و رغبت بلکہ

---

[1] ہم تمہارے ہی سے تمہاری بات کا انصاف چاہتے ہیں ۱۲

بعینہ پہنچا دیں اور خشیت (خوف) تغیر سے اس لئے تھا کہ انہوں نے حضور
صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا تھا کہ:

مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مَا لَمْ أَقُلْهُ — جو کوئی میرے اوپر ایسی بات جھوٹ کہے جس کو میں نے
فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ — نہیں کہا تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں سمجھے

بعض صحابہ خوف کے مارے حدیث ہی نہیں بیان کرتے تھے۔ پھر محدثین کا احادیث
حوالہ میں بعض الفاظ میں تردید کرنا او نحو وغیرہ کہنا صاف دلیل ہے اہتمام حفظ
الفاظ اور احتیاط کی اس باب میں۔ ایسی حالت میں کتابتہً حدیثوں کا مدون نہ
ہونا ان کی حفاظت میں کچھ مضر نہیں ہو سکتا۔

عشق حدیث کی عظمت۔ تحریف و تبدیل سے خوف و خشیت۔ جس زمانہ میں حدیث
قید کتابت میں آئی اس زمانہ تک کے راویوں کے حالات اور ہر قسم کا ان کا
طریقِ عمل سب مدون ہیں محدثین کی یہ عادت ہے کہ اگر کہیں ایک لفظ میں بھی ذرا سا
احتمال ہوتا ہے تو دوسرا لفظ اس کا مرادف اور ہم معنی بھی نہیں رکھتے بلکہ صاف
لکھتے ہیں اَوْ نَحْوَہٗ یعنی یہ لفظ تھا یا اس کا ہم معنی یہ لفظ تھا اور رئیس المحدثین امام بخاریؒ
کی شرطیں روایت حدیث کے متعلق دیکھئے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ انسان کے بس کی
بات نہیں فرشتہ کر سکے تو کر سکے مگر اس بندۂ خدا نے لاکھوں حدیثوں میں سے
چھانٹ کر چار ہزار کے قریب ان ہی شرائط پہ پوری اترتی ہوئی حدیثیں صحیح بخاری
میں جمع کر کے کتاب بنا کر دکھا دی۔ محدثین کے حالات پڑھنے سے اس کا پورا

بلکہ غور کرنے سے مفید و معین معلوم ہوتا ہے کیونکہ کاتبین کے حافظہ
کو کتابت پر اعتماد ہونے سے ریاضت کا موقع کم ہو جاتا ہے اور ہر
قوت ریاضت سے بڑھتی ہے ہم نے ان پڑھ لوگوں کو بڑے بڑے طویل و
عریض جزئیات کا حساب زبانی بتلاتے اور جوڑتے دیکھا ہے بخلاف خواندہ
لوگوں کے کہ بے لکھے ان کو خاک بھی یاد نہیں رہتا اور یہ بھی ایک وجہ ہے

یقین ہوتا ہے کہ ان حضرات کو حدیثیں جمع کرنے کے ساتھ ان کی صحت اور حفظ
حالات کے متعلق بیحد کاوش تھی اور حافظوں کے حالات پر بھی کچھ تعجب نہ کرنا چاہئے
کیونکہ ابھی قریب کے زمانہ میں بھی ایسے ایسے حافظے موجود تھے کہ ہم نے اگر خود نہ
دیکھا ہوتا تو شاید سننے سے یقین نہ آتا حضرت مصنف مدظلہ نے حافظ رحمت اللہ
صاحب الہ آبادی کے حافظہ کی تعریف کی ہے۔ احقر اس سے پہلے حکیم عبدالمجید خاں صاحب
دہلوی کے اور مبشرہ خانصاحب علی گڑھی کے اور حکیم رحیم اللہ صاحب
بجنوری کے چشم دید واقعات حافظہ کے متعلق لکھ چکا ہے ان سے حضرات محدثین
کے حافظوں کی تصدیق ہوتی ہے لہذا یہ شبہ کہ حدیثیں شروع میں کتابۃً محفوظ
نہ تھیں محض بیجا ہے کیونکہ قریب قریب ان کے حافظوں کے اس زمانہ میں
بھی موجود ہیں ہاں اس زمانہ میں قلت کے ساتھ ہیں اور اس زمانہ میں کثرت
کے ساتھ تھے اس کی وجہ کتابت کا چرچا اور حافظہ سے استغنا اور ذہن کے
ساتھ شغف کا نہ ہونا ہے اور قانون فطرت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے وہ یہ

اس وقت لوگوں کے حافظہ کے ضعف کی۔ دوسرے وہ بھی وجہ ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا کہ ان سے اللہ تعالیٰ کو یہ کام لینا تھا اور اب تدوین احادیث و احکام کی جو کہ تدوین احادیث کا ثمرہ تھا اس سے مغنی ہو گئی۔ اور یہ امر بھی فطرۃً جاری ہے کہ جس وقت جس چیز کی

ہے کہ جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے اس کو قدرت خود پیدا کرتی ہے اور جب اس سے استغنا ہو جاتا ہے تو قدرت اس کی پیدائش بند کر دیتی ہے اس کی نظیریں صدہا موجود ہیں مثلاً عورت کے بچہ پیدا ہوتا ہے تو چھاتیوں میں دودھ پیدا ہوتا ہے جب تک بچہ کو دودھ پلاتی رہتی ہے دودھ برابر پیدا ہوتا رہتا ہے اور جب دودھ چھڑا دیا جاتا ہے تو دودھ کی پیدائش بھی بند ہو جاتی ہے بدن میں کہیں چوٹ لگتی ہے تو تکلیف ہوتی ہے اس طرف کو دوران بڑھ جاتا ہے حتیٰ کہ بعض وقت اس کو روکنے کی ضرورت ہوتی ہے آج کل ایجاد کا زمانہ ہے ایک دنیا اس طرف متوجہ ہے اس کے لئے قدرتی سامان مہیا ہوتے چلے جاتے ہیں دماغوں میں اختراع کی قوت اس قدر پیدا ہو گئی ہے کہ پہلے زمانہ میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے پھر اس زمانہ میں بھی باہم ممالک میں اس قوت کے بارہ میں فرق ہے جہاں اس کا مشغلہ زیادہ ہے وہاں کے دماغوں میں یہ قوت بھی زیادہ ہے جیسے جرمنی کہ وہاں اس قسم کی گیسیں تیار ہوئی ہیں۔ جو صدہا میل کے فاصلہ سے دنیا کو ہلاک کر سکتی ہیں اور ان کے سامنے توپ بندوق سب مات ہو گئیں۔ انگریزی ضرب المثل

حاجت ہوتی ہے اس کے مناسب قویٰ پیدا کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ
اس وقت صنائع و ایجادات کے مناسب دماغوں کا پیدا ہونا اس کی
تائید کرتا ہے۔

ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ جب بھی ضرورت قدرتاً پیدا ہو یا انسان پیدا کرے تو اس کے پورا ہونے کا سامان قدرتاً پیدا ہو جاتا ہے بعض خطوں میں کوئی بیماری زیادہ ہوتی ہے تو وہاں کے لوگوں کو اس کے علاج بھی زیادہ معلوم ہیں جیسے کاٹھیاواڑ کے علاقہ میں موتی جھرہ جو ایک قسم کی چیچک ہے اور یورپ میں آتشک سوزاک اور ہندوستان میں پرسوت۔ بنا بریں کہا جا سکتا ہے کہ سلف کے زمانہ میں دین کی طرف رغبت بہت زیادہ تھی اور تمام تر توجہ اسی طرف تھی۔ جس کی نظیر کسی قوم میں اور کسی زمانہ میں نہیں مل سکتی تو اس میں تعجب کی کیا گنجائش ہے کہ قدرت نے اُن کو حافظے ایسے دیئے کہ یہ کام علی الوجہ الاکمل سرانجام کو پہنچا۔ اور جب سے کتابت کا رواج ہوا اُن حافظوں کی ضرورت نہ رہی لہذا قدرت نے پیدا کرنا بھی کم کر دیا۔ دیکھ لیجئے کہ اب بھی خواندہ لوگ دو چار دن کا حساب بھی بلا لکھے نہیں بتا سکتے اور ناخواندہ لوگ مہینوں کا حساب پائی پائی کا زبانی بتا سکتے ہیں۔ غرض سلف کے حافظوں کے متعلق شبہات نکالنا محض نازمانہ فہمی ہے۔

اور سچ بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو ان سے یہ کام لینا تھا لہذا حافظے ایسے

دے دیئے قدرت خدا کے سامنے یہ بات کچھ بھی مشکل نہیں۔ دیکھئے بعض جانوروں
کو حق تعالیٰ نے ایسا حافظہ دیا ہے کہ وہ راستہ نہیں بھولتے۔ جیسے بلی کہ جس گھر میں
ہل جاتی ہے اس کو نہیں بھولتی۔ راقم کا خود تجربہ ہے کہ ایک بلی بہت دق کرتی
تھی اس کو تھیلے میں بند کر کے دس دس میل کے فاصلہ پر ایسے ایسے موقعوں پہ
چھوڑ دیا کہ بیچ میں دریا بھی تھا۔ لیکن تیسرے دن موجود تھی۔ کبوتر دن بھر اڑتا ہے۔
اور شام کو اپنے ہی گھر آجاتا ہے نامہ بر کبوتر کسی وقت میں صدہا میل کے فاصلہ
پر ڈاک لے جاتے تھے اور جگہ نہیں بھولتے تھے۔ شہد کی مکھی راستہ نہیں بھولتی
قدرت کا تماشہ ان جنگلوں میں جا کر دیکھئے جہاں ایک ایک درخت میں سو سو محال
لگے ہوئے ہیں کبھی ایک محال کی مکھی دوسرے محال میں نہیں جاتی اور اگر کبھی غلطی سے
ایسا ہو جاتا ہے تو دوسری مکھیاں اس مکھی کے دو ٹکڑے کر کے پھینک دیتی ہیں۔
آج کل شہد کی مکھی سے نامہ بری کا کام لیا جاتا ہے اس طرح کہ ایک محال کے بادشاہ
کو پکڑ کر قید کر لیا جاتا ہے اس کے ساتھ اس محال کی تمام مکھیاں وہیں محال لگا لیتی
ہیں پھر اس محال کی چند مکھیوں کو فوجوں میں بہت دور بھیج دیا جاتا ہے جب ضرورت
ہوتی ہے تو خط لکھ کر فوٹو سے اس کو بہت باریک چھوٹے کاغذ پر اتار کر گولی بنا کر
ایک مکھی کے پیر میں باندھ دیا جاتا ہے اور اس کو چھوڑ دیا جاتا ہے وہ مکھی پشاور
سے کلکتہ تک اسی محال میں پہنچتی ہے جہاں اس کا بادشاہ قید ہے اس کے
پیر میں سے وہ خط کھول کر پڑھ لیا جاتا ہے۔

سُبْحَانَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ — پاک ہے وہ ذات جس کے قبضہ میں ہر چیز کی ملکیت

کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ — ہے اور اسی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے

جس نے ایسا حافظہ بکھی کو دیا ہے وہ انسان کو کیوں نہیں دے سکتا ہے پھر اگر دین کی حفاظت کے لئے ایک زمانہ میں ایسے حافظے پیدا کر دیئے کہ اب ویسے حافظے نہیں ہیں تو کیا تعجب کی بات ہے ہم دیکھتے ہیں کہ جس وقت جیسی ضرورت ہوتی ہے ویسا سامان قدرتی طور پر مہیا ہوتا ہے چنانچہ اپنے گھروں میں دن رات دیکھتے ہیں کہ بچہ پیدا ہوتا ہے اس وقت اس کو کسی بات کی حس و تمیز نہیں ہوتی لیکن اس کو دودھ پینا آتا ہے پستان مونہہ میں دیتے ہی چوسنے لگتا ہے یہ اسی اصول پر مبنی ہے کہ جیسی ضرورت ہوتی ہے ویسا سامان قدرت پیدا کرتی ہے اس سے بھی پہلے دیکھئے کہ بچہ ماں کے پیٹ میں رہتا ہے ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ پیر پھیلا کرتا ہے، اور مشیمہ (بچہ دانی) کے اندر کی جھلی) پھٹ جاتی ہے اور بچہ پیٹ سے باہر نکل آتا ہے پیر پھیلانے کی خواہش اس کو اس وقت سے پہلے کیوں نہیں ہوتی۔ یہ بھی اسی اصول پر مبنی ہے کہ جیسی ضرورت ہوتی ہے قدرت ویسا سامان پیدا کرتی ہے اسلام خدائی دین ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ — بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام

الْاِسْلَامُ۔ — ہی ہے۔

اور خدا تعالیٰ کو اس کی حفاظت اور تکمیل منظور تھی تو اس کے پورے سامان پیدا فرما دیئے دین سے عشق ہمیں حافظے ایسے دیئے کہ کسی دین کے لئے

اس کی نظیر نہیں مل سکتی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے اور اس کو خلاف فطرت کہنا کیا معنی رکھتا ہے یہ تو عین فطرت کے مطابق ہے اور اسی قدرتی اصل پر مبنی ہے کہ جیسی ضرورت ہوتی ہے قدرت ویسا ہی سامان پیدا کرتی ہے۔ دیکھئے آج کل صنعت و ایجاد کا زمانہ ہے تو کیسے کیسے دماغ پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے آم اور دیگر پھلوں کے طرح آدمی کے جسم میں بھی قلم چڑھا دیئے اور پیوندی آدمی بنا دیئے وغیرہ وغیرہ۔

یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے اس کو بھی حضرت مصنف مدظلہ نے حل کیا ہے وہ یہ ہے کہ جب کہ حق تعالےٰ کو دین کی حفاظت منظور تھی اس کے لئے تمام سامان پیدا کئے تو یہ کیوں نہ ہوا کہ احادیث کے لکھنے کی طرف سلف کو قرن اول ہی سے توجہ ہوتی اور تمام احادیث قید کتابت میں آجاتیں تاکہ ضائع ہونے سے بچ جاتیں اور یہ موقع کسی کو نہ ملتا کہ احادیث اتنے زمانہ کے بعد جمع ہوئی ہیں کہ اس وقت تک حافظوں پر محمول رہنا خطرہ سے عادۃً خالی نہیں۔ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ قرنِ اول میں احادیث کے لکھنے کا رواج نہ ہونے میں ایک خاص حکمت تھی وہ یہ کہ قرنِ اول میں جیسا کہ قرآن کی آیتوں کے یاد کرنے کا اہتمام تھا اسی طرح ان کے لکھنے کا بھی انتظام تھا جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے چنانچہ حضرت زید بن ثابت صحابی رضی اللہ عنہ اس خدمت پر مامور تھے وہ کہتے ہیں کہ جب وحی

لہ ۵ از جمع الفوائد جلد اول صفحہ ۲۶ باب روایۃ الحدیث ۱۲

نازل ہوتی تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سخت گرمی کا اثر ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ پسینہ پسینہ ہو جاتے اور چہرۂ مبارک سے پسینہ موتی کے دانوں کی طرح ٹپکنے لگتا۔ پھر یہ حالت رفع ہو جاتی اور میں فوراً کوئی کاغذ کا یا ہڈی کا ٹکڑا یا اور کسی چیز کا ٹکڑا لے آتا اور آپ بولتے جاتے اور میں اس پر لکھ لیتا پھر آپ فرماتے کہ پڑھو کیا لکھا ہے میں پڑھ کر سناتا اگر اس میں کچھ غلطی رہی ہوتی تو حضورؐ اس کو بنوا دیتے اس کے بعد میں اس وحی کو لوگوں کو سناتا یہ آیات قرآنی کے لکھنے کا انتظام تھا اگر اسی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ملفوظات (احادیث) کو بھی لکھا جاتا تو اسی زمانہ میں یا چند روز کے بعد حدیث قرآن میں خلط ملط ہو جاتا اور یہ بہتر نہ چلتا کہ یہ لفظ قرآن کا ہے یا حدیث کا اس واسطے لکھنا صرف آیات قرآنی کے ساتھ مخصوص رہا اور احادیث کی روایت زبانی رہی اس پر شاید کوئی یہ سوال کرے کہ اس خلط ملط سے بچنے کی یہ تدبیر تھی کہ جب کوئی لفظ ـــــ لکھوایا جاتا تو ساتھ ہی یہ زبانی بتا دیا جاتا یا لکھوا دیا جاتا کہ یہ لفظ قرآن کا ہے اور یہ حدیث کا تو یہ حدیث کی حفاظت بھی ہو جاتی اور غلطی بھی نہ ہوتا اس کا جواب یہ ہے کہ زبانی بتانے پر تو وہی اعتراض پڑتا کہ زبانی کا کیا اعتبار لامحالہ دوسری شق رہی کہ حدیث کے ساتھ لکھوا دیا جاتا کہ اس میں اتنا لفظ قرآن کا ہے اور اتنا حدیث کا لیکن یہ بھی بے سود بلکہ ناممکن تھا بیان اس کا یہ ہے کہ حدیث صرف قول رسول کا نام نہیں ہے بلکہ حدیث قول رسول کو بھی کہتے ہیں اور فعل رسول کو بھی اور تقریر رسول کو بھی (تقریر کے یہ معنی ہیں کہ کسی فعل کو برقرار رکھنا یعنی کسی کو کرتے دیکھ کر اس کو منع نہ کرنا)

بلکہ قول صحابی اور فعل صحابی اور تقریر صحابی بھی اسی کے ساتھ ملحق ہیں اور ان کو
بھی حدیث ہی کہا جاتا ہے ۔ اس کی وجہ کہ حدیث صرف قول رسول کو نہیں
کہتے یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے صرف کتاب اتارنے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ پیغمبروں
کو بھی عملی صورت سکھانے کے لئے مبعوث فرمایا بلا بعثت انبیاء کے دین کی تکمیل
نہیں ہو سکتی اس کی مثال بہت واضح ہے کہ فن خوشنویسی میں کتابیں موجود ہیں لیکن
کتابوں سے یہ فن ہرگز نہیں آسکتا بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ استاد زبانی بھی
بتائے اور اپنے ہاتھ سے لکھکر اور شاگرد کے ہاتھ سے بنوا کر حرفوں کی صورت
ذہن نشین کرائے حتیٰ کہ جب شاگرد کا ہاتھ صاف ہو جائے تو اس کے لکھے ہوئے
حرفوں کو پاس کر دے یعنی ان پر سکوت کرے ۔ زبانی بتانا گویا حدیث قولی ہے اور
اپنے ہاتھ سے لکھ کر دکھانا حدیث فعلی ہے اور شاگرد کے لکھے ہوئے حروف پر سکوت
کرنا حدیث تقریری ہے بلا ان تینوں طریقوں کے استعمال کے تعلیم فن خوشنویسی نہیں
ہو سکتی ۔ اسی طرح دین کی تعلیم بھی بلا حدیث قولی اور فعلی اور تقریری کے نہیں ہو سکتی
اب سمجھ میں آگیا ہوگا کہ حدیث کے ساتھ یہ لکھوا دینا کہ یہ حدیث قرآن نہیں ہے
کیا معنی رکھتا ہے قولی احادیث کے ساتھ تو یہ لکھوانا کسی طرح بجا ہو بھی سکتا ہے
لیکن فعلی اور تقریری احادیث کے ساتھ لکھوانا کوئی معنی نہیں رکھتا ۔ اور ہم کہہ
چکے ہیں صرف قولی احادیث تعلیم کے لئے کافی نہیں ہو سکتیں تو اگر قولی احادیث
کے ساتھ یہ لکھوا بھی دیا جاتا کہ یہ قرآن نہیں ہے حدیث ہے تب بھی بیکار تھا

اور حکمت عدم کتابت میں اس وقت یہ تھی کہ حدیث و قرآن کا خلط
نہ ہو جائے جب قرآن کی پوری حفاظت ہوگئی اور وہ احتمال خلط کا نہ
رہا اور نیز مختلف فرقوں کے ابھار کا ظہور ہوا اس وقت سنن کا جمع
ہوجانا اقرب الی الاحتیاط واعون علی الدین تھا -
دین کے لئے زیادہ باعث اعانت ۱۲

کیونکہ تعلیم دین کے واسطے انکی احتیاج دو قسم کی حدیثوں کی اور باقی ہے جو تعداد میں قسم اول سے بہت زیادہ ہیں۔ تو اس لکھوانے کا کوئی نفع نہ ہوتا اور نقصان یہ تھا کہ قرآن کے ساتھ خلط ہوجاتا لہذا کار آمد طریقہ یہی رہا کہ احادیث لکھی نہ جاویں اور صرف آیات قرآنی لکھی جاویں پھر جب تمام امت میں قرآن بلفظہ پھیل گیا اور خلط کا اندیشہ نہ رہا تو احادیث کی حفاظت کی طرف توجہ ہوئی اور ان کو قید کتابت میں لایا گیا اور اس کا وہ اہتمام کیا گیا کہ باید و شاید جس کی نظیر نہ کسی امت کے پاس ہے نہ کسی تاریخ میں ہے جیسا کہ بارہا بیان ہوچکا بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ زمانۂ رسالت میں تمام احادیث قولی کا لکھوانا قطع نظر ہونے کے ناممکن بھی تھا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ملفوظ جب حدیث قولی ہے اور حضور کے ملفوظات کبھی مجمع میں ہوتے کبھی دو چار آدمیوں کے سامنے ہوتے کبھی صرف ایک شخص سے کوئی خطاب ہوتا کبھی تنہائی میں ازواج کے ساتھ کبھی بچوں کے ساتھ کبھی معرکہ میں دشمنوں کے ساتھ ہوتا تو ان ملفوظات کے لکھنے کی کیا

صورت نہ تھی سوا اس کے کہ ایک کاتب ہر وقت جلوت میں اور خلوت میں
اور نشست و برخاست میں ساتھ رہے اور ہر ہر لفظ کو لکھے اور ساتھ ہی یہ
بھی لکھا جائے کہ یہ قرآن نہیں ہے حدیث ہے۔ بعض خطبے (تقریریں) بہت
لمبی ہوتیں جن کے درمیان میں کوئی کوئی لفظ قرآن کا بھی آتا تو ان لفظوں کے
ساتھ یہ بھی لکھا جاتا کہ یہ قرآن ہے مثلاً یہ لفظ ہوتا (انہ القرآن) تو بعد کے لوگوں
کو یہ دھوکا ہو سکتا تھا کہ یہ لفظ بھی قرآن ہی کا ہے چنانچہ یہ لفظ سورۃ واقعہ میں
موجود ہے ممکن ہے کہ اسی طرح بہت جگہ ہو تو قرآن میں ضرور غلط ملط ہو جاتا تمام
قولی احادیث لکھنے کی بھی کوئی صورت نہ تھی پھر ایسے مشغلہ کو شروع کرنا جو پورا
ہو نہ سکے اور مفید نہ ہو بلکہ مضر ہو بعید از عقل ہے۔ غرض صرف احادیث قولی کا
لکھا جانا بھی اس وقت ناممکن تھا اور احادیث فعلی اور تقریری کے لکھے جانے
کے تو کوئی معنی ہی نہیں۔ اور یہ جو ہم نے کہا کہ تعلیم دین کے لیے صرف قولی احادیث
کافی نہیں اول تو یہ بہت ظاہر ہے جیسا کہ ہم نے خوشنویسی کی مثال سے
ثابت کر دیا نیز اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ رسول کے ذمہ کام اتنے ہوتے ہیں کہ
تعلیم کے لئے ان کو ہر ہر شخص سے خطاب کرنا ناممکن ہوتا ہے لہذا اس سے
چارہ نہیں کہ ان کا فعل اور تقریر بھی حجت ہو۔ رسول کے ذمہ صرف امت ہی کی
تعلیم نہیں ہوتی بلکہ اپنے ذاتی اعمال بھی ہوتے ہیں اور وہ تمام امت سے
زیادہ ہوتے ہیں چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ارشاد ہوتا ہے:-

وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ — یعنی تم اور تمہارے بھائی ہارون میرے ذکر میں سستی نہ کرنا

اس سے ذاتی فرائض مراد ہیں کیونکہ رسالت کے فرائض کا ذکر اس کے آگے ہے:۔

اِذْهَبَا اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى — یعنی جاؤ تم دونوں فرعون کی طرف کیونکہ وہ بہت سرکش ہو گیا ہے

ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے:

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى — یعنی رب کی عبادت الٰہی میں مصروف رہو حتیٰ کہ موت

يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ — آ جائے (یقین سے مراد موت ہے)

غرض رسول کے ذمہ ذاتی فرائض بھی ہوتے ہیں اور اُمت کو تبلیغ کرنا اور تعلیم کرنا اور اُن کی اصلاح کرنا بھی ہوتا ہے فرماتے ہیں:۔

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ — یعنی اے رسول تبلیغ کیجئے اُن احکام کی جو پروردگار

اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ — کی طرف سے آپ پر اتارے گئے اور اگر آپ نے ایسا

تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ — نہیں کیا تو رسالت کا کام پورا نہیں کیا۔

اور فرماتے ہیں:۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ — یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ ہے کہ امت کے

وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ — سامنے آیات الٰہی پڑھتے ہیں اور ان کا تزکیہ نفس

وَالْحِكْمَةَ — کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتے ہیں۔

تلاوتِ آیات اور چیز ہے اور تعلیم کتاب اور چیز۔ تلاوت صرف الفاظ کے سنا دینے کو کہتے ہیں اور تعلیم اُن کے مفہوم پر عبور کرا دینے کو اور حکمت کتاب کے نکات و اسرار و غوامض و استنباطات کو کہتے ہیں یہ تینوں علم کے درجے ہیں اور تزکیہ نفس عمل کا درجہ ہے یعنی حضورؐ کا کام صرف تعلیم نہیں بلکہ عمل کا کامل کرا دینا بھی ہے جیسے خوشنویس کا کام شاگردوں کو صرف زبانی بتا دینا اور سمجھا دینا نہیں ہے بلکہ ہاتھ سے لکھ کر دکھانا اور شاگرد کو پورے طور پر مشاق بنا دینا ہے۔ اب آپ غور کریں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت چالیس سال کی عمر میں ملی پھر تیرہ سال حضورؐ نے مکہ معظمہ میں قیام فرمایا یہ زمانہ زیادہ تر مخالفین کے مقابلہ میں اور کفار کی فہمائش اور ان کی اصلاح کی کوشش اور ان کی ایذائیں سہتے میں گزرا اس کے بعد ہجرت فرمائی۔ ہجرت سے دس سال کے بعد وفات شریف ہوئی۔ یہ دس سال وہ زمانہ ہے جس میں رسالت کا کام کیا جو کچھ کیا اور اس میں بھی چین سے بیٹھ کر کام نہیں ہوا جہاد و غزوات قریب بیس کے اسی زمانہ میں ہوئے گو یہ بھی تعلیم ہی کے لئے تھے مگر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جس کو دس سال کے اندر بیس لڑائیاں پیش آئیں وہ دوسرا کوئی کام کیسے کر سکتا ہے لیکن سچ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ہر شان معجزہ اور خارق عادت تھی دس سال میں بیس غزوے بھی کئے اور عقائد کی تعلیم بھی کی اور اعمال کی تعلیم اور اصلاح بھی اور معاشرات اور اخلاق اور سیاسیات اور انتظام ملکی و مالی اور عبادات بدنی اور مالی کی تعلیم کی بھی بنفس نفیس حج بھی کیا اور

تمام مناسک بتائے مع اس کے کہ اپنے ذاتی فرائض بھی علی الوجہ الاکمل
ادا کیے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ دن بھر امت کی اصلاح میں اور سیاسیات اور شرعی
تعلیمات میں رہتے اور رات میں تہجد پڑھتے تو اس قدر کہ :-

تورمت قدماہ   یعنی پاؤں مبارک پر ورم آجاتا

روزہ رکھتے تو صوم وصال بھی رکھتے جس سے غایت شفقت کی وجہ سے امت
کو منع فرمایا ہے۔ راقم کہتا ہے کہ اور عبادات اور اشغال کو جانے دو کتب
احادیث میں صرف کتاب الدعوات کو پڑھو تو ثابت ہوگا کہ حضورؐ کا کوئی منٹ
اور کوئی سیکنڈ کسی دعا اور تسبیح وتہلیل سے خالی نہ تھا اور بلاخوف تردید کہا جاتا
ہے اور جس کا جی چاہے کر کے دیکھ لے کہ حضور کی تمام دعاؤں کو ان کے اوقات
پر ادا کرے تو ان ہی کا مشغلہ ایسا ہے کہ دوسرا کوئی کام اس سے نہیں ہو سکتا۔
چہ جائیکہ وہ تمام کام کیے جن کا اوپر ذکر ہوا اور ہر کام بوجہ احسن کیا اس خوبی کے
ساتھ کہ اعداء بھی داد دیتے ہیں الفضل ما شہدت بہ الاعداء اس طول طویل
تقریر سے صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ رسالت کے کام ایسے نہیں ہیں جو صرف
قولی حدیثوں سے پورے ہو سکیں بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کو حق تعالیٰ
نے نمونہ بنا کر بھیجا کہ امت حضورؐ کے اقوال کا بھی اتباع کرے اور اپنے افعال کو
حضورؐ کے افعال سے ملا کر درست کرے حتی کہ جس فعل پر حضورؐ نکیر نہ فرمائیں اس
کو بھی صحیح سمجھے۔ اگر تبلیغ رسالت صرف حدیث قولی پر رکھی جائے تو تبلیغ کا کام

کسی طرح پورا نہیں ہو سکتا بلکہ حضورؐ کی ذات واحد تمام اقطار عالم میں دین پہنچانے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی تھی اس واسطے کہا جاتا ہے کہ حضورؐ کی فعلی احادیث بھی حجت اور واجب الاتباع ہیں اور تقریری احادیث بھی۔ بلکہ حضورؐ ہی کی قولی احادیث کی رو سے حضورؐ کے سچے جانشینوں (صحابہ) کے اقوال و افعال بھی حجت ہیں وہ قولی احادیث یہ ہیں اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم[51] یعنی میرے صحابی مثل ستاروں کے ہیں ان میں جس کی بھی تم اتباع کرو گے ہدایت پاؤ گے۔ اور[52]

علیکم بسنتی و سنۃ   یعنی لازم پکڑو میری سنت کو اور خلفاء راشدین
الخلفاء الراشدین تمسکوا   کی سنت کو خلفا کی سنت کو دلیل ٹھہراو اور اس
بھا وعضوا علیھا بالنواجذ   کو دانتوں سے پکڑو۔

سنت طریقہ کو کہتے ہیں بلفظ دیگر مطلب یہ ہوا کہ صحابہ کی حدیث فعلی حجت ہے اور ظاہر ہے کہ جس کی حدیث فعلی حجت ہو اس کی حدیث قولی حجت کیوں نہ ہو گی اور ایک حدیث میں ہے :۔

[53] عن عمرؓ قال رسول اللہ   یعنی حضرت عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ فرمایا
صلی اللہ علیہ وسلم سألت   رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ میں نے اپنے

---

[51] از کتاب جمع الفوائد باب مناقب الصحابہ بروایۃ رزین ۱۲
[52] از کتاب جمع الفوائد از ترمذی کتاب الاعتصام بالسنۃ ۱۲
[53] از کتاب جمع الفوائد جلد ۲ باب فضل الصحابۃ بروایۃ رزین ۱۲

ربی عن اختلاف اصحابی
من بعدی فاوحی إلیّ یا
محمد ان اصحابك عندی
بمنزلة النجوم من السماء
بعضها اقوی من بعض ولكل
نور فمن اخذ بشئ مما هم
علیه من اختلافهم فهو
عندی علی هدی -

رب سے سوال کیا اپنے صحابہ کے
اختلاف کے بارہ میں جو میرے
بعد ہوگا پس وحی کی میری طرف کہ اے
محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے صحابہ میرے
نزدیک بمنزلہ آسمان کے ستاروں کے ہیں کہ
ایک دوسرے سے چھوٹے بڑے ہیں اور
نور ہر ایک میں ہے تو جو کوئی کسی بات پر ان کی اختلافی
باتوں میں سے عمل کریگا وہ میرے نزدیک
ہدایت پہ ہوگا ۔

اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ صحابی کا فعل بھی قابل تقلید اور حجت ہے حتی کہ دو صحابیوں کے دو فعل جو آپس میں مختلف ہیں ان میں سے ایک پر عمل کرنے والا بھی گمراہ نہیں ہے ان تینوں حدیثوں میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے ثابت ہو کہ صحابی کا صرف قول حجت ہے بلکہ صاف موجود ہے کہ ان کی اقتدا باعث ہدایت ہے اور اقتدا کبھی قول پر عمل کرنے سے ہوتی ہے اور کبھی فعل پر (خصوصاً حدیث دوم میں سنت الخلفاء الراشدین کا لفظ ہے اور سنت طریقہ فعلی ہی کو کہتے ہیں) تو ثابت ہوا کہ صحابی کی حدیث فعلی بھی حجت ہے ۔ اور صحابی کی حدیث تقریری کے حجت ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ کہا

جائے کہ کسی صحابی نے کسی کو کوئی کام کرتے دیکھ کر باوجود اس کو خلافِ دین سمجھنے
کے ٹوکا نہیں تو اس سے اُس صحابی پر ترکِ نہی عن المنکر کا اشکال وارد ہوتا ہے
جو شرعاً واجب ہے اور اس سے صحابی کی شان اعلیٰ اور ارفع ہے غرض اسی
قسم کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی احادیث سے صحابہ کی حدیثوں کا حجت
ہونا بھی ثابت ہے اسی بنا پر حدیث کی تعریف میں قولِ صحابی اور تقریرِ صحابی
کو بھی داخل کیا ہے اور اسی بنا پر علمائے محققین نے فرمایا ہے الصحابۃ کلھم عدول
یعنی صحابہ سب کے سب قابلِ اعتماد ہیں حتیٰ کہ حدیث مُرسل کو بھی حجت قرار
دیا ہے جس کی تعریف یہ ہے کہ تابعی نے صحابی کا نام نہیں لیا اور حدیث
کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کرکے بیان کیا کیونکہ تابعی اور حضورؐ کے
درمیان میں گو راوی کا نام نہیں لیا گیا ہے مگر یقیناً معلوم ہے کہ وہ کوئی
صحابی ہے اور صحابہ سب قابلِ اعتماد ہیں۔ غرض حدیث صرف قولِ رسول کا
نام نہیں ہے بلکہ فعلِ رسول اور تقریرِ رسول کا نام بھی ہے بلکہ قولِ صحابی اور
تقریرِ صحابی بھی اسی کے ساتھ ملحق ہے اور دین کی پوری تکمیل حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کی طرف احادیث قولی سے نہیں ہوئی بلکہ احادیث فعلی اور تقریری
سے بلکہ صحابہ کی بھی ہر قسم کی احادیث سے ہوئی ہے پھر یہ کہنا کہ احادیث بھی قرن
اول میں قیدِ کتابت میں آجاتیں کوئی معنی نہیں رکھتا۔

یہاں ہمارے کوئی ذہین بھائی یہ شبہ کرسکتے ہیں کہ جب دین کی

پوری تکمیل میں صحابہ کی احادیث کو بھی دخل ہے تو آیت الیوم اکملت
لکم دینکم کے کیا معنی ہوں گے یہ آیت حجۃ الوداع میں اتری اس کے
بعد کوئی آیت احکام کے بارہ میں نہیں اتری اس کا ترجمہ یہ ہے کہ
آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو پورا کر دیا۔ تو اگر دین اپنے
پورا ہونے میں احادیث صحابہ کا محتاج تھا تو نزول آیت مذکورہ کے وقت
تکمیل کے کیا معنی ہوں گے اس کا جواب دو طرح پر ہے ایک یہ کہ یہ اشکال
صرف حدیث صحابہ پر ہی نہیں پڑتا بلکہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی پڑتا ہے
کیونکہ یہ آیت حجۃ الوداع میں اتری ہے اس کے اترنے کے بعد ختم حج
تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حج کرنے والے آتے رہے اور مسائل
حج کے پوچھتے رہے اور حضور بتاتے رہے تو اگر اس آیت کے یہ معنے
ہیں کہ اس کے بعد کسی تعلیم کی گنجائش نہ تھی تو وہ تعلیمات جو اس آیت کے
نزول کے بعد ختم حجۃ الوداع تک بذریعہ قولی احادیث کے ہوئیں دین
سے زائد ٹھہرتی ہیں (حاشا عن ذلک) یہ جواب الزامی ہے۔ اور جواب تحقیقی
یہ ہے کہ آیت اکملت لکم دینکم کے معنے یہ نہیں ہیں کہ دین کے تمام
جزئیات بھی بیان ہو چکے بلکہ معنے یہ ہیں کہ دین کے اصول وقواعد اس طور سے
بیان ہو چکے کہ ان سے ہی تمام احکام دین کے قیامت تک مستنبط ہوتے رہیں
گے اور اب کسی نئے اصل وقاعدہ کے بیان کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

پس نہایت احتیاط سے حدیثیں جمع کی گئیں۔ چنانچہ اسانید و متون (سندوں ۱۲ الفاظ حدیث ۱۲) و اسماء الرجال (راویوں کے ناموں کی کتابیں) کے مجموعہ میں امعان نظر (ذہن غور ۱۲) سے قلب کو پورا یقین ہوتا ہے کہ اقوال و افعال نبویہ بلا تغیر و تبدل محفوظ ہو گئے ہیں۔

اس کو ہم نہایت اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ منجملہ آیات قرآنی کے ایک یہ آیت بھی اتر چکی تھی

مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ — جو حضور دیں اس کو لے لو اور جس سے
وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا — روکیں رک جاؤ۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ جو احکام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے ثابت ہوں ان کو بھی داخل دین اور ہمارا حکم سمجھو۔ اس میں احادیث رسول کل آگئیں اب وہ اشکال نہ رہا کہ نزول آیت اکملت لکم کے بعد جو مسائل حج کے تعلیم ہوئے وہ دین سے زائد ہیں۔ پھر حدیث قولی میں وارد ہے:-

علیکم بسنتی و سنۃ — میری اور میرے خلفاء کی سنت
الخلفاء الراشدین المھدیین — کو لازم پکڑو۔
من بعدی۔

نیز وارد ہے کہ:

اصحابی کالنجوم بایہم — میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں ان
اقتدیتم اھتدیتم — میں سے جس کی پیروی کرو گے ہدایت پاؤ گے

جن سے احادیث صحابہ کا حجت ہونا ثابت ہے تو جملہ احادیث صحابہ امر رسول ٹھہریں اور امر رسول امر اللہ ٹھہرا۔ ان اصول کے ممہد ہو جانے کے بعد آئندہ کسی اصل اور قاعدہ کی ضرورت نہیں رہی یہ اصول تمام دینی جزئیات تک کو حاوی ہیں اور ہماری اس تقریر سے آیت الیوم اکملت لکم کے متعلق کوئی اشکال نہیں رہا تو اب اگر کہا جاتا ہے کہ حدیث سے (جس میں حدیث رسول اور حدیث صحابہ سب داخل ہیں) تکمیل دین کی ہوئی تو اس کے یہ معنی نہیں کہ حدیث ایک اجنبی چیز ہے جس سے دین کی تکمیل ہوئی بلکہ حدیث بھی حکماً قرآن ہی کا ایک جزو ہے کیونکہ ما آتاکم الرسول کا مصداق ہے تو قرآن کی تکمیل قرآن سے ہوئی اور آیت اکملت لکم کی تاریخ نزول ہی میں ہوئی یہ جواب تحقیقی ہوا۔

قولہ پس نہایت احتیاط سے حدیثیں جمع کی گئیں "علماء اسلام کے پاس شرعی تاریخ جس کو علم حدیث کہتے ہیں ایسی مکمل ہے کہ جس کی نظیر نہ کسی دنیاوی تاریخ میں ہے نہ کسی دینی تاریخ میں دنیا کے کسی مذہب کو لے لیجئے علاوہ زائد سے زائد یہ کر سکتے ہیں کہ ایک کتاب مذہبی پیش کریں جس کے متعلق یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ کتاب آسمانی ہے (یہ علیحدہ بات ہے کہ یہ دعویٰ معیار صدق پر کسنے سے صحیح ثابت ہو یا غلط تاہم برائے نام کتاب پیش کر سکتے ہیں) مگر یہ کسی کا منہ نہیں کہ اپنے رہنما کے حالات جن پر کتاب کا اترنا مانتے ہیں اور ان کی عملی

لہ ص ۱۲

تعلیمات پورے طور سے پیش کر سکے ۔ یہ فخر اسلام کو حاصل ہے کہ کتاب آسمانی کے ساتھ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل سوانحعمری اور ہر قسم کی تعلیم پیش کر سکتے ہیں جس کے متعلق بعض متعصب عیسائیوں کو بالاضطرار یہ کہنا پڑا ہے کہ علماء اسلام اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہر وقت کی گفتگو نشست و برخاست چال ڈھال سب اس طرح بتا سکتے ہیں کہ گویا اس وقت سامنے ہیں حتی کہ وہ بتا سکتے ہیں کہ کنگھی اس طرح کرتے سرمہ اس طرح لگاتے کھانا اس طرح کھاتے پانی اس طرح پیتے سواری پر اس طرح چڑھتے سونے کے وقت اس طرح سوتے جاگنے کے وقت اس طرح جاگتے یہ سب بتا سکتے ہیں ۔ اس شرعی ذخیرہ کے فراہم ہونے کی حقیقی وجہ تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو یوں ہی منظور تھا اور صوری وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے دلوں میں دین حق کی محبت بدرجہ عشق ڈال دی اور اس ذخیرہ کے فراہم ہونے کے لئے جتنے اسباب ظاہری کی ضرورت تھی سب پیدا کر دیئے ۔ حافظے ایسے دیئے کہ اب لوگوں کو ان کا یقین بھی نہیں آتا ۔ دیانت اور تقوی ایسا دیا کہ دین تو بڑی چیز ہے تمام عمر میں دنیا کی کسی بات میں بھی ان سے جھوٹ ثابت نہیں ہوا روایت میں احتیاط کی یہ حالت تھی کہ ایک محدث دور دراز سفر کر کے کسی کے پاس حدیث سننے گئے دیکھا کہ ان کا گھوڑا چھوٹ گیا ہے اور اس کو پکڑنے کے لئے خالی توبڑا دکھا رہے ہیں تاکہ وہ دانہ کے لالچ میں آجائے بس یہ محدث

وہاں سے لوٹ آئے اور کہا کہ جو شخص گھوڑے کو خالی توبڑہ دکھا کر دھوکا دیتا ہے اس پر کیا اطمینان ہو سکتا ہے کہ روایت حدیث میں احتیاط کرے گا۔ بعض ائمہ حدیث کی یہ عادت تھی کہ کسی محدث اور استاد سے ایک دفعہ حدیث سُن کر اطمینان نہ کرتے اور دوبارہ[2] سہ بارہ[3] خفیہ طور پر ان کی مجلس میں پہنچتے اور سنتے رہتے اگر انہوں نے وہ حدیث پھر روایت کی اور الفاظ میں کچھ تغیر و تبدل نہ ہوا تب تو اس کو صحیح سمجھا ورنہ اس حدیث کو ترک کر دیا اور اگر زیادہ تغیر پایا تو اگر معلوم ہوا کہ عمداً ایسا کیا تو ساتھ ہی استاد کو تمام عمر کے لئے دجال کذاب مدلس وغیرہ کا خطاب دیا جو آج تک ان کے نام کے ساتھ لگا ہوا ہے اور اگر قرائن سے بلا عمد ایسا کرنا معلوم ہوا تو وہم اور غفلت کی طرف منسوب کیا ہمتوں کی اور حدیث کے ساتھ عشق کی یہ کیفیت تھی کہ ایک حدیث کے لئے منزلوں کا سفر کرتے اس زمانہ میں کہ سفر میں جان کا خطرہ بھی تھا اور مال کا بھی اور اس وقت سفر نمونۂ سقر کا مصداق تھا۔ حدیث کے ادب کی یہ حالت تھی کہ امام مالکؒ صاحب کے پاس کوئی حدیث سننے کے ارادہ سے آتا تھا تو امام صاحب غسل کرتے اور عمدہ لباس پہن کر باہر آتے اور نہایت ادب کے ساتھ حدیث سناتے ایک مرتبہ ایک بچھو کپڑوں میں تھا اور حدیث سنانے میں دس دفعہ اس نے ڈنک مارا جس سے امام صاحب سخت بے چین تھے اور چہرہ کا رنگ بدل بدل جاتا تھا مگر ادب کی وجہ سے حدیث کو درمیان میں قطع

نہ کیا اور لب و لہجہ میں تغیر نہ آنے دیا حدیث کو پورا کر کے کپڑوں کو اتارا ۔ امام مالکؒ نے "موطا" حدیث کی کتاب لکھی موطا کے معنے ہیں متفق علیہ یعنی وہ ایسی کتاب ہے کہ لکھ کر اس وقت کے علمائے کے سامنے پیش کی گئی اور سب نے اس کو بالاتفاق پسند کیا۔ اس سے موطا کی جلالت قدر کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ امام صاحب کے تورع اور عظمت رسول کی یہ حالت تھی کہ تمام عمر مدینہ طیبہ میں سواری پر سوار نہ ہوئے اور فرماتے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جس زمین پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک پڑے ہوں میں اس پر جانور کا قدم رکھوں ۔ بول و براز کے لئے شہر کے باہر جاتے کبھی حد حرم مدنی میں قضاء حاجت نہیں کی، ناظرین ذرا تو انصاف سے کہیں کہ یہ حضرات جن کے دل میں حضورؐ کے حرم کی یہ عظمت ہو وہ حضورؐ کی حدیث میں کچھ خلط ملط کر سکتے ہیں خصوصاً جب کہ حضورؐ کی یہ حدیثیں بھی سن چکے ہوں ۔

من کذب علی متعمداً فلیتبوأ	جس نے مجھ پر جھوٹ پلا جان کر تو
مقعدہ من النار ۔	وہ اپنا ٹھکانا دوزخ کو سمجھے

اور :-

کفٰی بالمرء کذباً ان یحدث	آدمی کے جھوٹا ہونے کو یہ کافی ہے کہ وہ
بکل ما سمع	ہر سنی ہوئی بات کو بیان کرے ۔

امام بخاریؒ نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے چھانٹ کر کتاب صحیح بخاری بنائی

---

۵ از بستان المحدثین مؤلفہ شاہ عبدالعزیز دہلوی ۱۲

جو اس وقت موجود ہے ایک ایک حدیث کو غسل کرکے اور دو[2] رکعت نماز پڑھ کر لکھا سولہ سال میں یہ کتاب تیار ہوئی۔ حضرت امام زبان کے اس قدر محافظ تھے کہ فرمایا ہے کہ مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن غیبت کے متعلق مجھ سے سوال نہ ہوگا کیونکہ میں نے کبھی کسی کی غیبت نہیں کی۔ ناظرین انصاف سے کہیں کہ کیا ایسا آدمی حدیث میں کچھ غلط ملط کر سکتا ہے۔

امام[1] مسلم نے تین لاکھ حدیثوں میں سے انتخاب کرکے صحیح مسلم لکھی۔ انھوں نے جو شرطیں روایت حدیث کے متعلق اپنی کتاب میں ملحوظ رکھی ہیں وہ امام بخاریؒ کی شرطوں سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ اُن کی خصوصیات میں سے ہے کہ انھوں نے نہ کسی کی تمام عمر غیبت کی نہ کسی کو مارا نہ برا بھلا کہا۔ کیا ایسا شخص حدیث میں گڑ بڑ کر سکتا ہے حاشا و کلا۔

امام[2] ابو داؤد سجستانی نے پانچ لاکھ حدیثوں میں سے چھانٹ کر اپنی کتاب سنن ابی داؤد بنائی جس میں چار ہزار آٹھ سو حدیثیں ہیں یہ عبادت اور زہد و تقویٰ میں ضرب المثل تھے لکھا ہے کہ ایک آستین کشادہ رکھتے اور ایک تنگ پوچھا گیا تو فرمایا کتاب لے جانے کے لئے ایک آستین چوڑی رکھنی پڑتی ہے اور دوسرے کے چوڑا رکھنے کی ضرورت نہیں لہذا اس کو چوڑا رکھنا داخل اسراف ہوگا کیا ایسا متورع شخص کذب علی الرسول جیسے گناہ

---

[1] از بستان المحدثین ۱۲ [2] از بستان المحدثین ۱۲

کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ استغفر اللہ۔

ایک محدث امام ابو عیسیٰ ترمذی ہیں جن کی کتاب جامع کبیر ترمذی مشہور کتاب اور صحاح ستہ میں سے ہے ان کا حافظہ بہت بڑھا ہوا ہے ان کا قصہ ہے کہ کسی زمانہ میں ایک محدث صاحب سے ایک دو جزو کی حدیث لکھ لی تھی لیکن محدث صاحب کو سنانے یعنی مقابلہ اور تصحیح کا موقع نہ ملا تھا۔ اتفاقاً عرصہ کے بعد ان محدث صاحب سے سفر مکہ میں ملاقات ہو گئی امام صاحب نے عرض کیا کہ میں نے ایک حدیث آپ سے لکھ لی تھی اس کو آپ کی زبان سے سننے کا موقع نہیں ملا تھا میں چاہتا ہوں کہ اب آپ اس کو سنا دیں محدث صاحب نے منظور فرمایا اور کہا اچھا وہ کاغذ نکالو اور میں حدیث کو پڑھتا ہوں غور سے سنو اور دیکھو کہ میرے اس وقت کے پڑھنے میں اور اس تحریر میں کچھ فرق تو نہیں ہے۔ یہاں قصہ یہ ہوا تھا کہ وہ تحریر امام ترمذی کے پاس سے گم ہو گئی تھی تو انہوں نے محدث صاحب کے خوف سے ایک سادہ کاغذ ہاتھ میں لے لیا اتفاقاً محدث صاحب کی نظر پڑ گئی کہ سادہ کاغذ ہاتھ میں ہے وہ بہت ناخوش ہوئے اور فرمایا کہ تم مجھ سے استہزا کرتے ہو عرض کیا کہ یا حضرت استہزا نہیں کرتا وہ کاغذ مجھ سے گم ہو گیا ہے۔ فرمایا پھر حدیث کا مقابلہ کیسے کرو گے۔ عرض کیا وہ حدیث مجھے یاد ہے اور ایسی محفوظ ہے کہ کاغذ میں بھی ایسی محفوظ نہ ہو گی۔ محدث صاحب کو یقین نہ آیا

اور فرمایا میں نہیں پڑھتا پہلے تم پڑھو دیکھوں تمہیں کیسی یاد ہے چنانچہ امام صاحب نے دو جزو کی حدیث ساری پڑھ دی اور کہیں فرق نہ تھا۔ محدث صاحب کو حیرت ہوگئی لیکن پھر بھی فرمایا کہ میں یقین نہیں کرسکتا کہ اتنی بڑی حدیث ایک دفعہ سن کر یاد ہوگئی ہو معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اس کو اور استادوں سے بھی سنا ہے اور بہت دفعہ سنا ہے۔ عرض کیا ایسا نہیں ہوا اور آپ کسی اور طریق سے میرا امتحان کریں۔ محدث صاحب نے ایسی چالیس حدیثیں جو اس وقت کسی اور محدث کے یہاں نہ تھیں ایک دم پڑھ دیں اور ان سے فرمایا سناؤ۔ انھوں نے وہ چالیس کی چالیس حدیثیں ترتیب وار مع سندوں کے پڑھ دیں اور کہیں غلطی نہیں کی۔ اس قسم کے امتحانات ان کے حافظہ کے متعلق بہت جگہ ہوئے لوگ حیرت میں رہ جاتے تھے امام ترمذی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی کتاب جامع کبیر ترمذی بڑی احتیاط سے لکھ کر پہلے علماء حجاز کے حضور میں پیش کی ان سب نے پسند کی بعد ازاں میں اس کو علماء عراق کے پاس لے گیا انھوں نے متفق اللفظ ہو کر بہت تعریف کی۔ اس کے بعد علماء خراسان کو دکھائی انھوں نے بھی پسند کی تب میں نے اس کو شائع کیا امام ترمذی کا ورع و تقوی ضرب المثل ہے خوف خدا سے اس قدر روتے کہ نابینا ہوگئے[له] ناظرین! اس قصہ سے نتائج ذیل پیدا ہوتے ہیں اول یہ کہ محدثین تحریر پہ

له کل منقول از بستان المحدثین مصنفہ شاہ عبدالعزیز صاحب دهلوی ۱۲

اعتماد نہ کرتے تھے بلکہ باوجود تحریر کے استاد کو سنا کر تصحیح کرتے تھے جیسے
عدالتوں میں کوئی خط پیش کیا جاتا ہے تو وہ اگرچہ اسی کاتب کی دوسری تحریروں
سے ملتا ہوا ہو لیکن کاتب سے زبانی تصدیق بھی کی جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ
اس وقت کے حافظے ایسے تھے کہ استاد کو بھی اعتماد تھا کہ میں ایک عرصہ کے
بعد اس حدیث کو اسی طرح پڑھ سکتا ہوں جیسے لکھوائی تھی اور شاگرد کا بھی ایسا
حافظہ تھا کہ وہ دو جزو کی حدیث شادی اور چالیس حاشیں ایک دفعہ سن کر
دہرا دیں۔ یہ حدیث کی کتابیں ان ہی حضرات کی ہیں جن کو آج کہا جاتا ہے کہ
تین قرن کے بعد لکھی گئی ہیں ان کا کیا اعتبار۔ تعجب ہے کہ تواریخ کا تو اعتبار
ہو اور احادیث کا نہیں۔ تیسرے یہ کہ جو شخص خوف خدا سے اتنا روئے کہ
آنکھیں کھو بیٹھے وہ حدیث میں غلط ملط کرنے سے کیسے نہ ڈرے گا۔ امام
ترمذی نے اپنی کتاب میں ایک مستقل اور ضخیم جزو شمائل نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم)
کا رکھا ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک اور عادات و اخلاق
وغیرہ درج کئے ہیں اس کو پڑھ کر یہ سماں آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے
کہ ایک محب فنا فی المحبۃ اپنے محبوب کی ہر ہر ادا کو مزے لے لے کر بیان کر رہا
ہے اور آج کل کے میلاد خوانوں کا سا بیان نہیں جس میں نہ روایت
صحیح ہے نہ درایت بلکہ ہر ہر بات کو سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں جس میں
خطا و غلطی کا احتمال ہی نہیں رہتا۔ شمائل ترمذی امت کے نزدیک اس قدر

مقبول ہے کہ بڑے بڑے علماء نے اس کی شرحیں لکھی ہیں اور مایۂ ناز سمجھا ہے۔ کیا ایسا محب شخص اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کوئی غلط روایت کر سکتا ہے خصوصاً جبکہ حضرت محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ لفظ بھی کان میں پڑ چکا ہو

من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار — جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ بولا وہ دوزخ کو اپنا ٹھکانا سمجھے

ذرا تو عقل و انصاف سے کام لینا چاہیے امام ترمذی کی اور بھی چند کتابیں ہیں اور سب مقبول ہیں۔

یہاں ہم کو حدیث کی کتابوں کی فہرست لکھنا مقصود نہیں بطور مشتے نمونہ از خروارے چند کتابوں کے نام لے دیئے ہیں اس سے منصف مزاج اور عقل سلیم والا آدمی اندازہ کر سکتا ہے کہ علم حدیث کس احتیاط کے ساتھ مکمل ہوا ہے ہم نے صرف پانچ کتابوں کا نام لیا ہے موطا امام مالک صحیح بخاری صحیح مسلم سنن ابوداؤد جامع ترمذی ان کے سوا بیشمار کتابیں حدیث کی ہیں مصنفین نے ہر ہر راوی کی تنقید کی ہے ان کے حالات اس وقت تک اسماء الرجال میں موجود ہیں انہوں نے جس راوی کی نسبت ذرا سا بھی شبہ پایا اس کی حدیث نہیں لی حتیٰ کہ اگر اس کے حالات صحیح طور پر نہ معلوم ہو سکے تو اس کو مجہول کہہ کر چھوڑ دیا گیا تاریخ کی ان کتابوں میں جن کو ہمارے بھائی یقینی صحیح سمجھتے ہیں اور جن کے حوالے دیا کرتے ہیں فی صدی ایک دو روایت بھی اس طرح کی دکھا سکتے ہیں

کہ اس کے نقل کرنے والے ایسے معتبر ہوں جیسے حدیث کے راوی
ہیں اور وہ شرطیں ان میں پائی جاتی ہوں جو محدثین نے روایت حدیث میں
رکھی ہیں حاشا وکلا پھر کیسا ظلم ہے کہ تاریخ کو معتبر کہا جائے اور اس پر یقین
کیا جائے جس میں فی صدی ایک دو (۲) روایتوں میں بھی صحت کی شرطیں نہ پائی جاتی
ہوں اور حدیث کو غیر معتبر کہا جائے جس میں فی صدی ایک دو بھی ایسی روائتیں
نہ ملیں گی جن میں شرائط صحت نہ پائی جاتی ہوں مسلمانو! خدا کے واسطے کہنا
خدا لگتی غرض فن حدیث کی تدوین ایسے مقدس لوگوں سے ہوئی ہے جن کو
حدیث سے عشق تھا اور ان کے دلوں میں حدیث کی عظمت تھی اور انہوں نے
سوائے دین کی محبت کے کسی لالچ سے یہ کام نہیں کیا۔ اور یہ کہنا بالکل صحیح ہے
کہ حدیثیں نہایت احتیاط سے جمع کی گئیں۔ اب ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس
کی شہادت میں زمانۂ حال کے بعض لیکچراروں کے اقوال بھی پیش کریں۔ کیونکہ
ہمارے بھائیوں میں یہ مذاق پیدا ہو گیا ہے کہ زمانۂ حال کے لیکچروں کو بہ نسبت
علماء کے خطبوں کے زیادہ پسند اور زیادہ قابلِ اعتبار سمجھتے ہیں یہ اقوال منتخب
کئے ہوئے ہیں اُن تین لیکچروں سے جو ڈاکٹر محمد زبیر صاحب صدیقی مولوی فاضل
ایم، اے، پی ایچ ڈی پروفیسر اسلامیات کلکتہ یونیورسٹی نے ۱۴ دسمبر ۱۹۳۲ء
اور ۱۵ دسمبر اور ۲۱ دسمبر ۱۹۳۲ء کو آسوتوش بلڈنگ میں دیئے یہ لیکچر
انگریزی میں تھے ان کا ترجمہ محمد عزیز صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی رفیق دار المصنفین

نے کر کے رسالہ معارف میں شائع کرایا۔

پروفیسر موصوف نے اول ان کتابوں کا ذکر کیا جو فن حدیث کے متعلق زمانۂ حال کے یورپین مستشرقین نے لکھی ہیں پھر بیان کیا کہ ڈاکٹر اسپرنگر سابق پرنسپل مدرسہ کلکتہ اور ان کے بعد سر ولیم میور نے پھر گولڈ زیہر نے بہت وسیع معلومات اس فن کے متعلق جمع کی ہیں۔ انہی کے جمع کردہ مواد پر پروفیسر گیلام کی کتاب (احادیث اسلام) کی بنا ہے پروفیسر گیلام وہ فاضل ہیں جنہوں نے احادیث کے وسیع لٹریچر کی ایک ضخیم فہرست تیار کی ہے جو ایک بہت قابل مستشرق پروفیسر کی نگرانی میں چھپ رہی ہے یہ ان کی خدمت بقول لیکچرار تمام دنیائے اسلام کو ہمیشہ ممنون[1] احسان رکھے گی پروفیسر محمد زبیر صاحب فرماتے ہیں کہ احادیث کے سلسلہ میں مسلمانوں نے جس غیر معمولی سرگرمی کا ثبوت دیا ہے دنیا کی علمی تاریخ اس کی نظیر سے خالی ہے ان کا نظام اسناد جسے انہوں نے احادیث کے سلسلہ میں قائم کیا اور اسکا ہیولی پروردہ وسیع لٹریچر جو انہوں نے احادیث کے باقاعدہ اور ناقدانہ مطالعہ کی غرض سے تیار کیا۔ اور یا ان کی وہ کتابیں جن میں صحیح اور موضوع حدیثوں کے

---

[1] یہ لیکچرار کے الفاظ ہیں اور راقم کہتا ہے۔ ؎

ز وصف نا تمام ما جمال یار مستغنی است
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

فن حدیث کی خدمت علماء اسلام اتنی کرچکے ہیں کہ کسی غیر کی خدمت کی حاجت نہیں۔ ۱۲

چھانٹنے کے لیۓ موضوعات سے بحث کی گئی ہے یہ سب آج بھی دنیا کی علمی تاریخ میں بے مثال ہیں۔ اگرچہ کچھ حدیثیں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں بھی قلم بند ہو چکی تھیں تاہم دوسری صدی تک یکجا کرنے (کتابی صورت میں لانے) کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس صدی کے شروع میں حضرت عمر ثانی (خلیفہ عمر بن عبدالعزیز) نے بعض محدثین کو وہ سب حدیثیں جمع کرنے کی ہدایت فرمائی جو مل سکتی تھیں۔ حضرت عمر ثانی کے بعد مختلف صوبوں کے متعدد محدثین نے اس عظیم الشان کام کو اٹھا لیا جس کی ابتدا خلیفہ موصوف نے کی تھی اور حدیثوں کے بہت سے مجموعے مرتب کیۓ جن میں سے بہت سے مفقود ہیں۔ لیکن ان کا ذکر ابن الندیم کی کتاب میں موجود ہے۔ پھر اس کے بعد دوسری اور تیسری صدی ہجری میں اور بہت سے مجموعے تیار کیۓ گئے یہ محفوظ ہیں اور دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمان ان کو پڑھتے ہیں محدثین کے یہ نامور و تلاش حدیث کی حیرت انگیز سرگرمی ظاہر کرتے ہیں حدیث سے ان کو کمال درجہ کی محبت تھی اس کے لیئے ان کے جوش و حوصلہ کی کوئی انتہا نہ تھی کوئی بھی مصیبت ایسی نہ تھی جو اس کی خاطر وہ برداشت نہ کر سکتے ہوں جو ان میں دولت مند تھے وہ اس کے لیۓ اپنی دولت قربان کر دیتے تھے اور جو غریب تھے وہ اپنی غربت کے باوجود اپنی زندگیاں اس کے لیۓ وقف کر دیتے تھے۔ الزہری نے حدیث کی خاطر دولت کو پانی کی طرح بہا دیا۔

ربیعہؒ نے اس کی تلاش میں اپنی تمام ملک صرف کردی اور آخر میں اپنے مکان کی شہتیریں بھی فروخت کر دیں اور ان سڑے ہوئے چھواروں پر زندگی بسر کرنے لگے جو اہلِ مدینہ پھینک دیا کرتے تھے۔ ابنِ سیرین جب کوفہ گئے تو وہاں چار ہزار طالب علم حدیث کے موجود تھے علی بن عاصم کے درس حدیث میں تین ہزار طلبہ شریک ہوتے تھے سلیمان بن حرب کے درس میں چالیس ہزار عاصم بن علی کے درس میں دس[10] لاکھ سے زائد یزید بن ہارون کے درس میں ستر ہزار[٥٠] ابو مسلم الکجی کے درس میں نہایت کثیر تعداد طلبہ حدیث کی ہوتی تھی جو لوگ لکھنے والے بیٹھتے تھے وہ چالیس ہزار سے زیادہ تھے۔ اس کے بعد ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جنہوں نے حدیثیں بنائیں اس کی ابتدا کے ذمہ دار حسب ذیل اشخاص ہیں۔ مبتدعین، جماعتوں کے سردار، مختلف فرقوں کے مبلغ۔ امرا کے خوشامدی، قصہ گو۔ لیکن علم حدیث کی تاریخ کے ہر دور میں ایک کثیر تعداد حق پسند خدا ترس متدین حفاظ محدثین کی بھی رہی جو نہ تو اشخاص اور جماعتوں کی پروا کرتے تھے اور نہ قوت اور رائے عامہ سے ڈرتے تھے ان کی زندگی کا واحد مقصد اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو حاصل کرنا ان کی اصالت اور صحت کو محفوظ رکھنا اور مسلمانوں میں ان کی اشاعت کرنا تھا وہ حدیثوں کا مطالعہ نہ تفریح اور وقت گزاری کے لیے کرتے تھے نہ مالی نفع اور شہرت

کے لئے اور نہ اس لئے کہ لوگ ان کا اثر قبول کریں۔ حدیث کو وہ حدیث کے لئے حاصل کرتے تھے۔ ان کے نزدیک علم وسیلہ نہیں بلکہ مقصد تھا بقول سفیان ثوریؒ کے تحصیل حدیث ان کے لئے ایک مرض ہو گئی تھی جس سے خود انہیں کوئی چارہ نہ تھا۔ صحابہ حدیثوں کے بیان کرنے میں حد درجہ احتیاط کرتے تھے۔ محدثین کے دوسرے دور میں بہت سے ایسے تھے جو اسناد حدیث کے بارہ میں نہایت متدین اور سخت تھے۔ اسی طرح ان کے بعد جو آئے مثلاً امام شافعی۔ یحییٰ بن معین۔ احمد بن حنبل۔ امام بخاری۔ امام مسلم۔ ابو داؤد۔ ترمذی۔ اور دوسرے اکثر محدثین یہ سب روایت کے معاملہ میں بے حد محتاط تھے۔ یہ متدین محدثین جو علم حدیث کے فنون میں تاریخ اسلام کی ابتداء ہی سے جماعتوں کی کشاکش سے بالکل علیحدہ رہے اور صاحب اقتدار جماعت سے کسی قسم کا واسطہ نہ رکھتے تھے۔ بعضوں نے باوجود اس کے مقتدر جماعتوں سے بڑی بڑی ایذائیں برداشت کیں مثلاً سفیان ثوریؒ۔ انس بن مالکؓ۔ احمد بن حنبلؒ۔ اور بہت سے دوسرے محدثین نے خلفاء بنی عباس کے ہاتھوں قید اور مختلف قسم کی سزائیں برداشت کیں۔ یہ انہی متدین اور محتاط محدثین کی مسلسل جانفشانیوں کا نتیجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں تلف ہونے سے محفوظ رہیں۔

گولڈ زیہر کہتا ہے کہ دنیائے اسلام کے ایک سرے سے دوسرے تک اندلس سے وسط ایشیا تک حدیث کے یہ جفاکش اور نہ تھکنے والے متلاشی گشت کرتے اور ہر مقام سے اپنے سامعین کے لئے حدیثیں جمع کرتے رہے۔ حدیثوں کو جو مختلف صوبوں میں پھیلی ہوئی تھیں ایک مستند شکل میں جمع کرنے کا یہی تنہا ممکن طریقہ تھا۔ الرحّال[1] یا الجوّال[2] کا معزز لقب ان سیاحوں کے لئے لفظی ہی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اور طوّاف الاقالیم[3] کے لقب میں ان کے لئے کوئی مبالغہ نہیں ہے ان میں سے بعض ایسے تھے جنہوں نے تمام مشرق و مغرب میں چار مرتبہ سفر کیا تھا۔ ان تمام ملکوں میں ان کے سفر کی غرض مناظر کا دیکھنا یا تجربہ حاصل کرنا نہ تھا بلکہ ان کا مقصد ان مقامات میں محدثین سے ملنا اور ہر ایک سے حدیث سننا اور مستفید ہونا تھا۔ موجودہ مجموعوں کی شکل میں احادیث کی تدوین پہلی صدی ہجری کے آخر میں شروع ہوئی اور اس کے بعد تیزی کے ساتھ ہوتی رہی یہاں تک کہ تیسری صدی کے ختم سے پہلے ہی حدیث اور متعلقات حدیث پر تقریباً تمام مستند اور اہم کتابیں لکھ لی گئیں۔ تدوین حدیث کے ساتھ ساتھ محدثین تمام رواۃ کے حالات بھی دریافت کرکے ان کی حیثیات پر نقد و تبصرہ کرتے گئے اور احادیث کے جرح و تعدیل کے لئے ان رواۃ کے حالات پر ایک وسیع لٹریچر تیار کرلیا۔ اور موضوعات پر

۱؎ بہت سفر کرنے والا ۱۲ ۲؎ ہر جگہ گھومنے والا ۱۲ ۳؎ تمام ممالک میں گشت کرنے والا ۱۲

ایک ضخیم دفتر تیار کر دیا۔ اور جرح و تعدیل کے لئے بہت سے فنون قائم کئے (لیکچروں کا خلاصہ ختم ہوا) ان لیکچروں کے نقل کرنے سے غرض صرف یہ دکھلانا ہے کہ فن حدیث کس اہتمام کے ساتھ مدون ہوا اور وہ کیسا عظیم الشان علم ہے جس پر وہ لوگ بھی فدا ہیں جو مذہبی نظر سے اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتے بلکہ صرف تاریخی نظر سے تعلق رکھتے ہیں وہ اس وقت اس کے جمع کرنے میں مصروف ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی حلوائی کی دکان کی تعریف صرف یہ دیکھ کر کرے کہ اس میں ہزاروں طرح کی رنگ برنگ کی مٹھائیاں اور حلوے اور مربے سجے ہوئے ہیں کہ اتنی تعداد ہیں اور اس خوبصورتی اور صفائی کے ساتھ دنیا میں کسی دکان میں یہ سامان نہیں ہے حالانکہ ابھی اس نے واقعہ کسی مٹھائی اور حلوے اور مربے کا نہیں چکھا اگر اس نے واقعہ کسی ایک کا بھی چکھ لیا تو مست ہو جائے گا اور خدا جانے اس وقت اس کی کیا حالت ہوگی۔ وائے بر حال ان لوگوں کے جو اسی دکان میں رہتے تھے مگر ان مٹھائیوں اور حلووں اور مربوں سے ایسے بیزار ہیں کہ ان میں عیب نکالتے ہیں اور ان کی صورت دیکھنے اور پاس بیٹھنے سے بھی متنفر ہیں سوا اس کے کیا کہا جائے کہ ان کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اور وہ وقت آنے والا ہے کہ ان کی بے خبری اور لاپروائی اور کفران نعمت کی وجہ سے دکان ان کی لٹ جائے اور دوسروں کے پاس چلی جائے پھر وہ اس کو کھائیں گے

اور قسم قسم کے وظائف اور تماشے اٹھائیں گے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ حدیث
کے متعلق شبہات و اعتراضات انہی لوگوں کو سوجھتے ہیں جن کو کسی قسم کی
لیاقت اور کسی علم سے مناسبت نہیں صرف انگریزی کے دو چار حرف
پڑھ کر اور بی اے ایم اے ہیں کہ ان کے دماغ میں خیال پیدا ہو گیا دیگرے نیست
بس کیا ہے ان کو چاہیے کہ علوم دنیا ہی میں ترقی کر کے اس لیاقت کو پہنچیں
جس پر ڈاکٹر اسپرانگر اور سر ولیم میور اور گولڈزیہر پہنچے ہوئے ہیں اس سے
کم از کم اتنا ضرور ہوگا کہ تاریخی میدان کی وسعت اور علوم و فنون کی قدر اور علم حدیث
کی جلالت اور اپنی جہالت معلوم ہو جائے گی۔ آخر کوئی بات تو ہے کہ مستشرقین
مورخین حدیث کی طرف جھکتے جاتے ہیں حالانکہ ابھی ان کی نظر حدیث پر صرف
تاریخ کے طور پر پڑی ہے اگر حدیث کے معانی اور تعلیمات پر پڑی اور ان
کو بنظر انصاف دیکھا اور ہدایت قسمت میں ہوئی تو حضرت عبداللہؓ بن سلام
کی طرح ایک ہی حدیث کو سن کر بیساختہ کہہ اٹھیں گے کہ یہ کلام سوائے
نبی کے کسی کا نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ علم کسی طرح کا بھی ہو کچھ نہ کچھ

؎۱ حضرت عبداللہؓ بن سلام علمائے یہود میں سے تھے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ
تشریف لائے تو یہ بغرض تحقیق حضور کی مجلس میں حاضر ہوئے اور ایک حدیث سنی جس کا مفہوم یہ تھا کہ جو کوئی
نرم زبان سے بولے اور سلام کثرت سے کرے اور لوگوں کو کھانا کھلایا کرے اور رات کو اس وقت نماز
پڑھا کرے جبکہ لوگ سوتے ہوں تو وہ امن و امان کے ساتھ جنت میں جائے گا۔ اس
کو سن کر عبداللہؓ بن سلام بے ساختہ کہنے لگے کہ یہ کلام سوائے نبی کے کسی کا نہیں ہو سکتا اور
فوراً اسلام لے آئے ۱۲ منہ

روشنی رکھتا ہے پس اگر طبیعت سلیم ہو تو سچی بات دل کو لگ جاتی ہے اور انسان اس کے قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے علم حدیث کی تدوین و تکمیل ایسی ہوئی ہے کہ اگر طبیعت میں حق پسندی اور انصاف ہے تو حدیث کی سندوں کی حالت اور علم اسماء الرجال یعنی راویوں کے حالات اور حدیث کے الفاظ ان سب چیزوں کو بنظر غور دیکھنے سے دل کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات صحیح صحیح ہم تک منتقل ہو کر پہنچ گئی ہیں دیکھئے ہزاروں برس پہلے کی تاریخ ہم پڑھتے ہیں - اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اس کو تسلیم کرتے ہیں حالانکہ نہ وہاں سند ہے نہ راویوں کے نام ہیں نہ ان کے حالات معلوم ہیں بلکہ یقیناً معلوم ہے کہ بعض مورخین میں تقوے و دیانت کچھ بھی نہ تھا اور ان کا تراش خراش کرنا بھی ثابت ہے لیکن تاریخ کو تسلیم کیا جاتا ہے اور حدیث کا ہر ہر جزو ثابت ہے اور ہر ہر جزو کے متعلق ضخیم کتابیں موجود ہیں پھر نہ معلوم کیوں نہیں تسلیم کیا جاتا اور کیوں اس میں طرح طرح کے بے بنیاد شبہات نکالے جاتے ہیں - کچھ تو انصاف کرنا چاہیئے -

انکار حدیث کا بیان

کچھ دنوں سے جب سے کہ آزادی کی ہوا چلی ہے ایک جماعت میں جو

مذہب کے قیود سے آزاد ہونا چاہتی ہے حدیث و سنت کے انکار کی عجب وبا
پھیل گئی ہے۔ مذہبی قیود زیادہ تر حدیث و سنت ہی کے ذریعہ سے عائد
ہوتی ہیں کیونکہ قرآن ایک اصولی کتاب ہے جس میں مذہب کے متعلق صرف
اصولی اور کلی قوانین ہیں تمام جزئیات کا اس میں استقصا[1] نہیں ہے اور نہ
ہو سکتا تھا۔ ان اصول و کلیات کی تشریحات کا دارومدار تمامتر حدیث و سنت
پر ہے اس لئے آزادی پسند طبیعتیں سرے سے حدیث و سنت کی حجت ہی کا
اور ان کے واجب العمل ہونے کا انکار کرتے ہیں کیونکہ جب حدیث و سنت
کوئی شے نہ رہے گی تو مذہبی قیود بہت کم ہو جائیں گی اور دین صرف چند
عقائد اور تھوڑے سے اعمال کا نام رہ جائے گا اور اس آزادی کی وبا صرف
ان کی ذات ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ عام مسلمانوں
کو اس میں شریک کریں اس کے واسطے رسالے لکھے گئے ہیں اور طرح طرح
سے یہ تحریک پھیلائی جا رہی ہے اور بزعم خود قرآن و حدیث ہی سے حدیث و
سنت کا غیر معتبر اور ناقابل عمل ہونا ثابت کیا جاتا ہے یہ ثابت کرنے والے
نہ علمی لیاقت رکھتے ہیں نہ ان کی نظر حدیث پر ہے نہ تفسیر پر نہ طبقات اور
رجال پر نہ تاریخ پر اسی وجہ سے ان کے استدلالات عجیب و غریب اور
مضحکہ انگیز ہوتے ہیں کہیں ترجمہ غلط کہیں مفہوم غلط کہیں نتیجہ غلط کہیں ناتمام حوالہ
ہے اور کہیں مفروضات سے استدلال۔ غرض جہالت تدلیس خیانت کم نظری

---

[1] احاطہ ۱۲

ناواقفیت کا کوئی نمونہ ایسا نہیں جو ان کی تحریروں میں نظر نہ آتا ہو لہذا ضرورت ہے کہ اس پر کافی روشنی ڈالی جائے۔

انکارِ حدیث کے متعلق ان کے استدلال حسب ذیل ہیں

۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت حدیث سے منع فرمایا۔

۲۔ خلفاء حدیثوں کو قابلِ حجت نہیں سمجھتے تھے چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حدیث کی روایت سے منع فرمایا اور روایت کرنے والوں کو سزا دی۔

۳۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حدیثوں کو قبول نہیں کرتے تھے۔

۴۔ بعض حدیثیں ایسے صحابہ سے مروی ہیں جن کو قرآن نے مردود الشہادت قرار دیا ہے۔

۵۔ خود صحابہ اور ائمہ نے بعض حدیثوں کی نسبت بُری رائے ظاہر کی۔

۶۔ احادیث کی تدوین حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی صدی کے بعد ہوئی۔

ہم ان لغویات کے متعلق فرداً فرداً کلام کریں گے۔ اس کلام کرنے سے پہلے ایک تمہید سن لیجئے وہ یہ ہے کہ سمجھنے کی بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے تمام دنیا کے لئے رسول بنا کر بھیجا رسول کا ترجمہ پیغام بر یعنی پیغام پہنچانے والا ہے اس کا اختصار پیغمبر ہے۔ پیغمبر کی حیثیت

دنیا کے سامنے کیا ہوتی ہے۔ کیا اس کی حیثیت صرف قاصد یا پوسٹ مین کی سی ہوتی ہے کہ اس کا کام صرف زبانی یا تحریری پیغام پہنچا دینا ہوتا ہے اور یہ خدمت ادا کرنے کے بعد اس کا کام ختم ہو جاتا ہے اور اس کو اس زبانی یا تحریری پیغام ادا کرنے کے سوا اور کچھ کہنے سننے کا حق نہیں ہوتا۔ اگر ایسا ہے تو بے شک حدیث و سنت کوئی چیز نہیں بنتی کیونکہ پیغام خداوندی کتاب اللہ ہے جب اس کو بندگان خدا کو پہنچا دیا تو مکتوب الیہم کے کسی کام میں دخل دینے کا حق باقی نہیں رہا۔ لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے اور خود کتاب خداوندی بتاتی ہے کہ رسول کا کام صرف کتاب کو پہنچا دینا نہیں ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کتاب الٰہی پہنچانے کے ساتھ اس کی شرح کرنا اور سمجھانا اور عقائد عبادات معاملات اخلاق سب کے نمونے دکھا دینا اور اچھی طرح سمجھا دینا اور مشق کرا دینا بھی ہے چنانچہ فرماتے ہیں :-

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي	خدائے تعالیٰ وہ ہے جس نے امّی
الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ	(غیر تعلیم یافتہ) قوم میں ان ہی میں سے ایک
يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَ	رسول بھیجا جو ان کے سامنے خدا تعالیٰ کی
يُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ	آیتیں پڑھتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ	اور ان کو کتاب الٰہی اور حکمت سکھاتا ہے۔

اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف یہی نہیں بتایا گیا کہ آپ آیتوں کو پڑھ کر لوگوں کو سنا دیتے ہیں بلکہ یہ بھی کام حضورؐ کا ہے کہ لوگوں کو پاک کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ پاک کرنا بمعنی پانی سے دھونے کے نہیں ہے بلکہ تزکیۂ قلب ہے یعنی دلوں کو امراض باطنی سے پاک صاف کر دینا اور یہ طرح طرح کے مجاہدوں اور مشقتوں سے ہو سکتا ہے اور ان مجاہدوں اور مشقتوں کے طریقے اپنے ذہن اور عقل سے دریافت نہیں ہو سکتے یہ موقوف ہیں وحی کی تعلیم پر کیونکہ جن لوگوں نے بلا تعلیم وحی کے اپنی عقل سے وہ طریقے ایجاد کئے طرح طرح کے دھوکوں میں پڑے جن کی حقیقت تعلیم وحی کے مقابلہ سے معلوم ہوتی ہے ؎

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

اور اس تعلیم کے لئے صرف تلاوتِ آیات کافی نہیں بلکہ خود عمل کر کے دکھانے اور عمل کرنے والوں کی غلطیاں پکڑنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے یہ درجہ تزکیہ کا ہے لیکن اب تک بھی ذمہ داری نبوت کی ختم نہیں ہوئی دو کام اور باقی ہیں تعلیم کتاب اور حکمت۔ تعلیم کتاب اور حکمت کیا چیز ہے۔ خصوصاً اس پر نظر کرتے ہوئے کہ قرآن کے مخاطب اول جن پر قرآن اترا عرب تھے جن کی مادری زبان عربی تھی ان کو تو تعلیم

۱؎ جس شخص نے پیغمبرؐ کے خلاف راہ اختیار کی وہ ہرگز کبھی منزل تک نہ پہنچے گا۔

کتاب صرف پڑھ کر سنا دینے سے بخوبی ہو سکتی تھی اور اگر اس میں تزکیہ قلب کے طریقے بالتفصیل مذکور تھے تو یزکیھم کی ضرورت نہ تھی پھر جاتے کہ ابھی دو درجے اور باقی ہیں۔ تو وہ کون سا درجہ تعلیم کا ہے جس کو ویعلمھم الکتاب والحکمۃ سے تعبیر فرمایا۔ ہر ادنیٰ سی عقل والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ درجہ یتلوا علیھم اور یزکیھم کے سوا ہے۔ اس کا پتہ ہم کو آیت ہی سے لگتا ہے وہ آیت یہ ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ — یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں

رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ — بہترین نمونہ ہے

اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور کا ہر فعل اور قول اور جملہ حرکات و سکنات نمونہ ہیں اور قابل تقلید ہیں ان ہی اقوال و افعال کو حدیث و سنت کہتے ہیں اس موقع پر یہ بات بھی نظر میں رکھنی چاہیے کہ کلام اللہ ایک اصولی کتاب ہے جس میں امور دین کے متعلق صرف کلی اصول ہیں ہاں کہیں بضرورت کسی جزئی سے بھی تعرض کیا گیا ہے تاہم جزئیات کی تفصیل کلام اللہ میں نہیں ہے نہ ہو سکتی ہے ان جزئیات کی تفصیل کے لئے حضور کی ذات پاک زندہ کتاب ہے جس کا ہر جملہ متن قرآن کی شرح ہے اس کا پتہ بھی آیت قرآنی سے چلتا ہے۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمْ
یعنی نہیں اتاری ہم نے آپ پر کتاب مگر اس لئے کہ آپ اس کو کھول کھول کر واضح بیان کریں۔

اور

اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ
یعنی ہم نے آپ پر ذکر کو اس واسطے اتارا کہ آپ اس کو لوگوں کے لئے واضح طور پر بیان کردیں۔

ظاہر ہے کہ جہاں تک قرآن کی عربی عبارت کا تعلق ہے ہر اہل عرب سمجھ سکتا تھا پھر اس تبیین اور توضیح کے کیا معنے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں کچھ اور بھی ہے جس کی توضیح نبی ہی کر سکتا ہے۔ یہی توضیح حدیث و سنت ہے۔ حدیث میں اس مفہوم کو اس سے زیادہ صاف اور واضح بیان کیا گیا ہے وہ حدیث یہ ہے :-

عن زیاد بن لبید قال ذکر النبی صلی اللہ علیہ وسلم شیئا فقال ذاک عند اوان ذھاب العلم قلت یا رسول اللہ وکیف یذھب العلم ونحن نقرء القرآن ونقرئہ ابناءنا ویقرئہ ابناءنا ابناءھم الی یوم القیمۃ قال ثکلتک امک یا زیاد ان کنت لاراک من افقہ رجل بالمدینۃ اولیس ھذا

زیاد بن لبید سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز کا بیان کیا کہ یہ علم کے جاتے رہنے کے وقت ہوگی میں نے عرض کیا یا رسول اللہ علم کس طرح جاتا رہے گا حالانکہ ہم قرآن کو پڑھتے ہیں اور پڑھاتے ہیں اور ہماری بعض اولاد پڑھتی پڑھاتی رہے گی قیامت تک حضور نے

اليهود والنصارى	فرمایا تجھے تیری ماں روئے میں تو تجھ کو
يقرؤن التوراة والانجيل	مدینہ کا بڑا سمجھدار آدمی سمجھتا تھا کیا یہود و نصاریٰ توریت
ولا يعلمون بشيء منهما	اور انجیل کی تلاوت نہیں کرتے لیکن ان میں
(ابن ماجہ باب ذہاب العلم)	جو کچھ ہے اس کو ذرا بھی نہیں جانتے ۔

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کے محض لفظی معنے سمجھ لینے سے اس کا پورا علم حاصل نہیں ہوتا اسی لئے نبی کو اس کی وضاحت کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ توضیح نبی کے بیان سے ہوتی ہے اسی کا نام حدیث و سنت ہے اور وہ جو کچھ بیان کرتا ہے وہ اس کی طرف سے نہیں بلکہ خدا ہی کی طرف سے ہوتا ہے خود قرآن فرماتا ہے

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ	یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے
هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى	کچھ نہیں بولتے وہ جو کچھ فرماتے ہیں وہ
	نہیں ہے مگر وحی خدا کی طرف سے ۔

اور فرماتا ہے :-

اِنَّا اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ	یعنی ہم نے کتاب تم پر سچائی کے ساتھ اتاری
بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ	اس لئے کہ تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو
بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ	جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو سمجھایا ہے ۔

سب جانتے ہیں کہ حضور جو فیصلے کرتے تھے اس میں صرف آیات قرآنی

نہیں پڑھ دیتے تھے بلکہ اپنے الفاظ میں سوال و جواب فرماتے تھے انہیں کی نسبت فرمایا ہے۔ بما اراک اللہ اسی و حدیث و سنت کہا جاتا ہے۔ اور قرآن فرماتا ہے:-

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ — یعنی اگر تم حق تعالیٰ کو محبوب رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو حق تعالیٰ تم کو اپنا محبوب بنالیں گے۔

اس آیت میں فاتبعوا القرآن نہیں فرمایا بلکہ حضورؐ کے اتباع کا امر فرمایا معلوم ہوا کہ حضورؐ کا اتباع قرآن سے سوا اور باتوں میں بھی ضروری ہے اور اتباع اقوال میں بھی ہوتا ہے اور افعال میں بھی اقوال کو اکثر حدیث اور افعال کو اکثر سنت کہا جاتا ہے اور دونوں میں کوئی فرق کا قائل نہیں۔ اور ایک آیت میں اس کو بہت ہی صاف عنوان سے فرمایا ہے۔

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ — یعنی جو کوئی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

اور فرمایا ہے:-

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ — یعنی ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر اس واسطے کہ اس کی اطاعت کی جائے

یوں نہیں فرمایا کہ:-

ما انزلنا من کتاب الا لیعمل بہا — ہم نے کسی کتاب کو نازل نہیں کیا مگر اس لئے کہ اس پر عمل کیا جائے

غرض اس قسم کی بے شمار آیتیں ملیں گی جن سے حدیث و سنت کا قابل حجت اور واجب العمل ہونا اور اطاعت رسول کا عین اطاعت الٰہی ہونا ثابت ہو۔

اب اس کے متعلق احادیث سنیئے

عن ابی هریرةؓ عن رسول الله صلی الله علیه وسلم انه قال من اطاعنی فقد اطاع الله ومن عصانی فقد عصا الله (رواہ مسلم والبخاری)	یعنی فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔

یہ حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کے متعلق ہے جو قرآن کی تصریحات کے علاوہ ہیں کیونکہ قرآن کی تصریحات کی موافقت و مخالفت تو بداہتہً اطاعت اللہ یا عصیان اللہ ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

دوسری حدیث

عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ما امرتکم به فخذوه وما نهیتکم عنه فانتهوا (ابن ماجہ جلد ا)	یعنی فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس بات کا میں تم کو حکم دوں اس کو کرو اور جس بات سے منع کر دوں اس سے باز رہو۔

اس میں بھی حدیث اول ہی کی تقریر ہے کہ یہ اوامر و نواہی علاوہ تصریحات قرآنی کے ہیں۔

تیسری حدیث جو بہت صریح ہے۔

عن المقدام بن معدیکرب	مقدام بن معدیکرب رض روایت کرتے ہیں کہ
الکندی ان رسول اللہ صلی اللہ	فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
علیہ وسلم قال یوشک الرجل	نے کہ ممکن ہے کہ کوئی[1] آدمی اپنی مسند
متکئا علی اریکتہ یحدث	پر اکڑ کر بیٹھا ہوا ہو اور اس کے سامنے
بحدیث من حدیثی فیقول	میری کوئی حدیث پڑھی جائے تو وہ
بیننا و بینکم کتاب اللہ	یوں کہنے لگے کہ ہمارے تمہارے درمیان
عزوجل فما وجدنا فیہ	کتاب اللہ (قرآن) موجود ہے۔ ہم
من حلال استحللناہ وما	جو چیز اس میں حلال پائیں گے اس کو
وجدنا فیہ من حرام حرمناہ	حلال سمجھیں گے اور جو اس میں حرام
الا وان ما حرم رسول اللہ	پائیں گے اس کو حرام سمجھیں گے۔
مثل ما حرم اللہ (رواہ ابن ماجہ)	آگاہ ہونا چاہیے کہ جس چیز کو اللہ کے رسول نے حرام کیا
	وہ بھی اللہ کی حرام کی ہوئی چیز کی طرح حرام ہے۔

.... اس سے زیادہ صریح حدیث موضوع بحث کے

---

[1] اس لفظ سے اس خیال کی کہ حدیث واجب العمل چیز نہیں بنا معلوم ہوگئی کہ وہ تکبر ہے ۱۲

متعلق کون سی ہو سکتی ہے منکرین حدیث غور کریں۔

اب وہ حدیثیں بھی سنئے جن میں خاص سنت کا لفظ ہے گو حدیث کے واجب العمل ثابت کر دینے کے بعد اس کی ضرورت باقی نہیں رہتی کیونکہ حدیث و سنت باعتبار حکم کے ایک ہی چیز ہے لیکن ہم ابنائے زماں کے حیلہ تراشیوں اور بہانہ ڈھونڈھنے کی عادت کو دیکھ کر خاص سنت کے لفظ کو بھی پیش کرتے ہیں۔

عن عرباض بن سارية قال	روایت ہے حضرت عرباض بن ساریہ سے
صلى لنا رسول الله صلى الله عليه	کہا انہوں نے کہ ایک دن فجر کی نماز ہم کو
وسلم صلوٰة الفجر ثم وعظنا	جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی بعد
موعظة بليغة ذرفت عنها	نماز ایک نہایت بلیغ وعظ فرمایا جس سے آنکھیں
العيون ووجلت منها القلوب	نکلیں اور دل کانپ گئے ایک شخص نے عرض کیا
فقال قائل يا رسول الله كانها	یا رسول اللہ یہ وعظ آخری معلوم ہوتا ہے اس لئے
موعظة مودعة فاوصنا	ہم کو کچھ وصیت فرما دیجئے۔ فرمایا میں تم کو خدا
فقال اوصيكم بتقوى الله	سے ڈرنے کی اور امیر المومنین کی
والسمع والطاعة وان كان	اطاعت و فرمانبرداری کی وصیت کرتا
عبدا حبشيا فانه من يعش	ہوں اگرچہ وہ امیر ایک حبشی غلام ہو کیونکہ
بعدي فسيرى اختلافا كثيرا	جو کوئی میرے بعد جیئے گا وہ بہت سے

فعليكم بسنتي وسنة الخلفاء
الراشدين المهديين عضوا
عليها بالنواجذ ۔ (مسند دارمی)

اختلاف دیکھے گا ۔ سو تم میری سنت
کی اور خلفاء راشدین کی سنت کی پیروی
کرنا اور اس کو دانتوں سے پکڑے رہنا ۔

یہ حدیث کس قدر صریح ہے احتجاج بالحدیث والسنت کے بارہ میں
معلوم نہیں ہمارے بھائی اس کے بعد کیا حیلہ نکالیں گے ۔ اور سنیئے ۔

عن معاذ بن جبل ان رسول الله
صلى الله عليه وسلم لما بعثه
الى اليمن قال كيف تقضي
اذا عرض لك قضاء قال
اقضي بكتاب الله قال فان لم
تجد في كتاب الله قال فبسنة
رسول الله صلى الله عليه وسلم
قال فان لم تجد في سنة رسول الله
قال اجتهد برأيي ولا آلو قال
فضرب رسول الله صلى الله عليه
وسلم على صدره وقال الحمد لله
الذي وفق رسول رسول الله

روایت ہے حضرت معاذ بن جبل سے
کہ جب ان کو جناب رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم نے یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو
دریافت فرمایا کہ جب تمہارے سامنے کوئی مقدمہ
آئے گا تو اس کا فیصلہ کیسے کرو گے ۔ عرض کیا
کتاب اللہ کے موافق کروں گا ۔ فرمایا اگر اس
کا حکم تم کتاب اللہ میں نہ پاؤ ۔ عرض کیا حضور
کی سنت کے موافق فیصلہ کروں گا ۔ فرمایا
اگر سنت میں بھی نہ پاؤ ۔ عرض کیا اس صورت میں
اپنے اجتہاد سے کروں گا اور اس میں کسی قسم
کی کوتاہی نہ کروں گا ۔ وہ کہتے ہیں کہ اس پر
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینہ پر دست

لما یرضی به رسول الله	مبارک مارا اور ترایا خدا کا شکر ہے جس نے
(مشکوٰۃ عن الترمذی و ابی داؤد و	اپنے رسول کے رسول (نائب) کو
الدارمی فی باب العمل فی القضاء	ایسی بات کی توفیق دی جس کو اس کا
والخوف منہ)	رسول پسند کرتا ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)

یہ حدیث موضوع بحث (احتجاج بالسنت) کے بارہ میں کس قدر صریح ہے
اب معترضین کے ان دلائل کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جو حدیث و سنت کی مخالفت میں پیش کی جاتی ہیں۔ سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کتابت حدیث سے منع فرمایا ایک حدیث یہ ہے :-

لا تکتبوا عنی و من کتب عنی	میری کوئی بات مت لکھو اور جس نے مجھ سے قرآن
غیر القرآن فلیمحہ	کے علاوہ کچھ لکھا ہو اس کو چاہیئے کہ مٹا ڈالے

اس حکم سے حدیث و سنت کے ناقابل حجت اور ناواجب العمل ہونے کا نتیجہ پیدا کیا جاتا ہے۔ معلوم نہیں یہ کونسی منطق ہے۔ دعوے کو دلیل سے کوئی تعلق ہونا چاہیے۔ کسی بات کے قلمبند کئے جانے کی ممانعت اور شے ہے اور اس کا واجب العمل ہونا اور شے۔ کتابت کی ممانعت سے اس کا نفاذ کہاں سے ساقط ہو جائے گا۔ اگر کسی کو کوئی زبانی حکم دیا جاوے اور کسی مصلحت سے اس کو لکھنے سے ممانعت کر دی جائے تو کیا وہ نوکر

اس پر عمل کرنے کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ اور ہم تو سب سے پہلے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر حدیث قابلِ عمل چیز نہیں تو جملہ لا تکتبوا عنی الخ اور دیگر احادیث جو اس دعوے کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں ان پر عمل کیوں کیا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی تو حدیث ہی ہیں اور حدیث کو غیر قابلِ عمل کہا جاتا ہے۔ حق یہ ہے کہ حدیث وسنت ضرور واجب العمل ہیں اور معترضین کا ممانعت کتابت سے استدلال عدمِ وجوبِ عمل پر بالکل غلط ہے اور عوام کو دھوکہ دینا ہے کیونکہ دعوے اور ہے اور دلیل اور۔ علاوہ بریں یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ اگر کتابت سے ممانعت کی بھی گئی تو وہ کن حالات اور کن مصالح کی بنا پر تھی اور وقتی تھی یا دائمی ہم حدیثوں ہی سے کتابت اور روایت کی اجازت ثابت کرتے ہیں جس سے صاف ثابت ہو جائے گا کہ ممانعت اگر تھی تو وقتی تھی اور وہ اس مصلحت سے تھی کہ حدیث و قرآن میں خلط ملط نہ ہو جائے جب اس کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو اجازت ہو گئی اور صحابہ لکھنے لگے۔ لکھنے کا ثبوت سنیے :-

عن عبد اللہ بن عمرو قال	عبد اللہ بن عمروؓ روایت کرتے ہیں کہ میں جو کچھ حضور
كنت اكتب كل شيء اسمعه	صلی اللہ علیہ وسلم سے سنتا تھا سب لکھ لیتا تھا
من رسول اللہ صلی اللہ علیہ	تاکہ حفظ رہے۔ قریش نے مجھ کو اس سے منع
وسلم اريد حفظه	کیا اور کہا تم حضور کی ہر بات لکھتے ہو حالانکہ حضور

فنهتني قريش وقالوا أتكتب
كل شيء تسمعه، ورسول الله
صلى الله عليه وسلم
بشر يتكلم في الغضب
والرضا فامسكت عن
الكتابة فذكرت
ذلك الى رسول الله
صلى الله عليه وسلم
فاومى باصبعه الى فيه
فقال اكتب فوالذي نفسي
بيده ما يخرج منه الا الحق
(ابوداؤد ج ۲ و بخاری و مسلم)

انسان ہی تو ہیں غصہ میں بھی بولتے
ہیں اور رضا میں بھی (مطلب یہ کہ غصہ میں
بےجا باتیں بھی منہ سے نکل جاتی ہوں گی.
ان کو لکھنا نا زیبا ہے) ان کے کہنے سے
میں لکھنے سے رک گیا پھر میں نے اس کا ذکر حضور
صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا، آپ نے اپنی
انگلی سے دہن مبارک کی طرف اشارہ
کر کے فرمایا کہ قسم ہے اس کی جس کے قبضہ میں
میری جان ہے کہ اس میں سے نہیں نکلتی مگر
حق بات (مطلب یہ ہے کہ قریش کا یہ
خیال غلط ہے کہ میرے منہ سے غصہ میں
جابیجا بات نکل جاتی ہوگی۔ میں غصہ میں کبھی
مغلوب نہیں ہوتا اور نہ کبھی میرے منہ سے بیجا
بات نہیں نکلتی لہذا لکھنے میں کچھ حرج نہیں)

اور مسند دارمی میں ہے:-

عن عبد الله بن عمرو انه
اتى رسول الله صلى الله

روایت ہے عبد اللہ بن عمرو سے کہ وہ
جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت

علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ	ہیں آئے اور کہا یا رسول اللہ میں چاہتا ہوں
انی ارید ان اروی من	کہ آپ کی احادیث روایت کروں اس لئے
حدیثک فاردت ان	چاہتا ہوں کہ اپنے قلب کی یادداشت کے ساتھ اپنے
استعین بکتاب یدی	ہاتھ کی تحریر سے بھی مدد دوں اگر آپ اسے مناسب
مع قلبی ان رائیت ذلک	خیال فرمائیں فرمایا اگر میری حدیث ہے (یعنی
فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ	تم نے اس کو خوب سمجھ لیا ہے اور اس میں
وسلم ان[۱] کان حدیثی ثم	کوئی بات مشکوک نہیں رہی) تو اس کو یاد کر لو پھر
استعن بیدک مع قلبک	اپنے قلب کے ساتھ اپنے ہاتھ سے بھی مدد لے
	سکتے ہو (یعنی لکھ سکتے ہو)

اور یہ بھی واضح رہے کہ یہ اجازت صرف حضرت عبد اللہ کے ساتھ خاص نہ تھی بلکہ بہت سے صحابہ حدیثیں لکھا کرتے تھے اور آپ کے علم اور اجازت سے لکھتے تھے سنیئے:

عن ابی قبیل رض قال سمعت	روایت ہے ابو قبیل رض سے کہا انہوں نے میں نے
عبد اللہ بن عمرو قال	سنا عبد اللہ بن عمرو رض سے کہ انہوں نے کہا کہ
بینا نحن حول رسول اللہ	اس اثنا میں کہ ہم گرد اگرد جناب رسول اللہ صلی اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نکتب اذ	علیہ وسلم کے (حدیث) لکھ رہے تھے کہ ایک

---

[۱] نسرہ الشاہ ولی اللہ الدہلوی بان معناہ ان کان حدیثا یقینا من غیر شبہۃ فاحفظہ ثم استعن بیدک ۱۲ منہ

سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ای المدینتین تفتح اولا قسطنطینیۃ ام رومیۃ الخ

شخص نے حضورؐ سے پوچھا کہ دو شہروں یعنی قسطنطنیہ اور رومیہ میں سے کونسا پہلے فتح ہوگا۔

اس سے صاف ثابت ہے کہ صحابہ حدیث لکھا بھی کرتے تھے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لکھا کرتے تھے۔ اور بعض وقت دوسروں کی درخواست پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی لکھوا دیا کرتے تھے۔ چنانچہ فتح مکہ میں جب آپ نے تحریم حرم کے متعلق خطبہ فرمایا تو ایک یمنی ابوشاہ نامی نے درخواست کی کہ یارسول اللہ مجھ کو یہ احکام لکھوا دیئے جائیں اور ان کی درخواست پر آپ نے فرمایا۔

اکتبوا لابی شاہ (مسلم کتاب الحج باب تحریم مکہ جلد اوّل) یعنی ابوشاہ کے لئے لکھ دو۔

یہ جو کچھ لکھا گیا قرآن تو تھا نہیں اس کو حدیث کہتے ہیں لہذا کتابت حدیث حضورؐ کے حکم سے ثابت ہوگئی۔ اور حضورؐ کے مرض وفات کا مشہور واقعہ بخاری اور مسلم اور سب کتابوں میں موجود ہے کہ جب وفات شریف قریب ہوئی تو فرمایا کہ قلم دوات یا کاغذ اور دوات لاؤ میں تمہارے لئے ایک تحریر لکھ دوں تاکہ تم میرے بعد گمراہ نہ ہو (مسلم جلد ۲۔ اور بخاری کے مختلف ابواب میں ہے) آپ نے کس چیز کے لکھنے کے لئے قلم دوات منگائی تھی ظاہر ہے کہ وہ حدیث تھی۔ یہ بھی واضح رہے کہ یہ حضورؐ کا آخری فعل ہے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمال کو بہت سے احکام لکھوا کر بھیجے جن پر حضرات خلفائے راشدین کے عہد میں بھی عمل ہوتا رہا۔ یہ احادیث ہی ہوئیں یا کچھ اور۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تحریری ہدایات علم حدیث کا مجموعہ ہیں۔ اور سب کو معلوم ہے کہ حضورؐ نے مقوقس شاہ روم کو اور شاہ فارس کو فرمانِ رسالت لکھوائے تھے جن کی نقل اس وقت تک موجود ہے بلکہ بعض مقامات پر اصل بجنسہٖ محفوظ ہے اور ان کی نقلیں بذریعہ فوٹو کے لے کر دنیا میں شائع ہوئی ہیں ان کو حدیث کہا جائے گا یا ان کا کچھ اور نام ہے ان کا ثبوت من وجہ قرآن پاک میں موجود ہے:

قُلْ يَآ اَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ (الآیۃ)

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حکم خداوندی نازل ہوا کہ اہل کتاب کو توحید و اسلام کی دعوت دیجئے چنانچہ حضورؐ نے تبلیغی خطوط بھیجے آپ نے اس کتابت تبلیغی کو قرآن مجید کا مدلول سمجھا یہ حدیث ہوئی یا کچھ اور۔ یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ اگر بالفرض والتقدیر یہ بھی کہا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابتِ حدیث سے کلیۃً منع فرمایا تھا تب بھی اس دلیل کو دعوے سے کیا علاقہ ہے دعویٰ تو یہ ہے کہ روایت حدیث ناجائز ہے اور حدیث و سنت ناواجب العمل اور ناواجب الطاعۃ ہے اور دلیل یہ ہے کہ کتابتِ حدیث سے منع فرمایا گیا۔ کتابت اور چیز ہے اور

روایت اور واجب العمل ہونا اور چیز۔ اسی واسطے ہم نے کہا تھا کہ عجیب طوفانِ بے تمیزی ہے کہ یہ بھی نہیں دیکھا جاتا کہ دلیل کیا ہے اور دعوے کیا۔ کسی قانون کے نفاذ اور واجب العمل ہونے کے لئے اس کا تحریری ہونا ضروری نہیں خصوصاً عہد رسالت میں تو تحریر کی ضرورت ہی نہ تھی۔ ادھر زبان مبارک سے کچھ نکلا ادھر اس پر عمل شروع ہو گیا اور پھر یہ عمل تواتر کی شکل میں چلا اس لئے تحریر کی ضرورت ہی نہ تھی اگر احکام شرعی کو بلا تحریر واجب العمل نہ کہا جائے تو کیا عجب ہے کہ کوئی یہ بھی کہہ دے کہ نبی پر بھی صرف القا کافی نہیں جب تک غیب سے تحریر نہ آئے اس وقت تک نبی بھی اس کی تعمیل اور تبلیغ کا مکلف نہ ہوگا۔ روایت حدیث کے متعلق صاف موجود ہے:۔

حدثوا عنی ولا حرج (مسلم)

یعنی مجھ سے حدیث کی روایت کرو اس میں کچھ حرج نہیں۔

بلکہ حضورؐ نے مبلغِ حدیث کے لئے دعا فرمائی ہے:

عن زید بن ثابت قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول نضر اللہ امرأ سمع منا حدیثا

زید بن ثابت فرماتے ہیں کہ میں نے سنا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہ فرماتے تھے کہ خدا اس شخص کو تر و تازہ اور شاداب رکھے جس نے ہم سے کوئی حدیث

فحفظه حتى يبلغه فرب حامل فقه الى من هو افقه منه ورب حامل فقه ليس بفقيه

(ابوداؤد ج ۲ باب فضل نشر العلم)

سنی اور اس کو محفوظ رکھا یہاں تک کہ دوسرے کو پہنچا دے کیونکہ بسا اوقات علم کا حامل اس کو ایسے شخص تک پہنچاتا ہے جو اس سے زیادہ سمجھ دار ہوتا ہے اور بسا اوقات حامل خود سمجھ دار نہیں ہوتا۔

حضورؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں اخیر میں یہ بھی فرمایا کہ:۔

فليبلغ الشاهد الغائب

یعنی جو لوگ موجود ہیں میری ان ہدایات (احادیث) کو ان لوگوں کو بھی پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں:۔

اس ارشاد سے روایت حدیث کا جواز بلکہ وجوب ثابت ہوتا ہے اسی بنا پر بعض صحابہ نے بعض ایسی احادیث کو بھی جن کو مدۃ العمر کسی مصلحت سے مخفی رکھا تھا مرتے وقت روایت کر دیا تاکہ امر تبلیغ کی تعمیل ہو جائے۔ نیز اس ارشاد سے حدیث کا حجت ہونا بھی ثابت ہوتا ہے کیونکہ موٹی بات ہے کہ حدیث کو صرف کانوں تک پہنچا دینا ایک بیکار بات ہے مقصود عمل کرانا ہے۔ اور یہ ارشاد حجۃ الوداع میں صادر ہوا تھا جو زمانہ رسالت کا آخری دور تھا اور جس میں اتنا بڑا مجمع مسلمانوں کا تھا کہ اس سے پہلے یا اس کے بعد کبھی نہیں ہوا اس کو کون سا ادنیٰ عقل والا بھی مان سکتا ہے کہ یہ ارشاد صرف سنانے کے لئے تھا اسی مجمع میں حضورؐ

نے تمام اعمال حج کے (مناسک) تعلیم فرمائے کیا وہ تمام تعلیمات صرف سنانے کے لئے تھیں اور موجودہ مجمع یا آئندہ کے لئے حاجیوں کے واسطے دستور العمل بنانے کے لئے نہ تھیں یہ بہت ہی موٹی بات ہے ہمارا قلم تو ایسی موٹی باتوں کے لکھنے سے بھی رکتا ہے مگر کیا کیا جائے کہ ہمارے بھائیوں نے دین کو کیا پس پشت ڈالا کہ عقل بھی ان سے رخصت ہونا چاہتی ہے وہ کون سا قانون ہے جو صرف سنانے کے لئے ہوتا ہے اور وہ کون سی تعلیم ہے جو دستور العمل بنانے کے لئے نہیں ہوتی اس کو تو کوئی بے سے برے اور باطل سے باطل مذہب والا بھی نہیں مان سکتا دیکھئے ہر مذہب والا اپنے مذہبی مسائل کے ثبوت کے لئے اپنے پیشواؤں کے مقولے اور ملفوظات پیش کرتا ہے اور ان کو حجت سمجھتا ہے۔ قرآن شریف کی آیت بھی اس کے متعلق سن لیجئے:۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ الآیہ

اس کو ہم اوپر بھی لکھ چکے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ وہ ہے جس نے ایسے رسول کو بھیجا جو تعلیم کتاب اور تزکیہ قلوب وغیرہ کرتے ہیں اسی آیت میں یہ لفظ بھی ہے:۔

وَّ اٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ

یعنی اس رسول کو صرف موجودہ زمانہ کیلئے نہیں بھیجا بلکہ ان لوگوں کیلئے بھی بھیجا ہے جو بعد کو آئیں گے۔

اس آیت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ جو کام رسالت کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجودین (صحابہ) کے واسطے کرتے تھے یعنی تلاوت قرآن اور تعلیم قرآن اور تعلیم حکمت اور تزکیہ قلوب یہ سب کام بابعد کے لوگوں کے لئے بھی کریں گے اور اظہر من الشمس ہے کہ یہ سب کام حضورؐ نے موجودین (صحابہ) کے واسطے بذریعہ تعلیم زبانی اور تعلیم عملی کے کئے تھے تو آئندہ زمانوں کے لئے بھی ان دونوں طریقوں سے تعلیم کی ضرورت کیوں نہیں ہے وہ تعلیم آئندہ آنیوالوں کے لئے سوائے روایت کے کس ذریعہ سے ہوسکتی ہے اسی کو حدیث کہتے ہیں غرض اس آیت سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ حدیث صرف موجودین کے سنانے کے لئے نہ تھی بلکہ آئندہ کے لئے بھی اس کے بقا کی ضرورت ہے اور اسی سے امر رسالت پورا ہوسکتا ہے منکرین حدیث غور کریں۔ غالباً انکار حدیث از روئے حدیث کے رد کے لئے ہماری اتنی تقریر کافی ہے۔

اب ہم منکرین حدیث کی دوسری دلیل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ خلفائے راشدین خصوصاً شیخین حدیثوں کو ناقابل حجت سمجھتے تھے اس کے ثبوت میں چند روایتیں پیش کی جاتی ہیں:- اول

عن ابی بکر قال انکم	یعنی روایت ہے حضرت ابوبکر سے کہ انہوں
تحدثون عن رسول اللہ	نے فرمایا کہ تم لوگ جناب رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم	صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت
احادیث تختلفون فیہا والناس	سی حدیثیں روایت کرتے ہو جن میں باہم
بعدکم اشد اختلافا فلا تحدثوا	اختلاف کرتے ہو اور تمہارے بعد کے لوگ اور زیادہ
عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ	اختلاف کریں گے لہذا تم کوئی حدیث حضور صلی اللہ
وسلم شیئا فمن سألکم	علیہ وسلم سے روایت نہ کرو اور اگر کوئی کچھ
فقولوا بیننا وبینکم کتاب اللہ الخ	پوچھے تو کہہ دو کہ ہمارے تمہارے درمیان
(تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳)	کتاب اللہ موجود ہے

اس کے متعلق سنئے یہ حدیث تذکرۃ الحفاظ کی ہے سب سے اول تو یہ بات قابل غور ہے کہ ایک ایسے مسئلہ (حدیث کے حجت ہونے نہ ہونے) کے متعلق جس میں سلفاً و خلفاً اختلاف نہیں ایسی کتاب کو پیش کرنا جو علماء کے نزدیک حدیث کی کتاب نہیں کہلاتی کہاں تک درست ہے تذکرۃ الحفاظ تاریخ کی کتاب ہے گو اس کو غیر معتبر نہ کہا جائے لیکن وہ فن حدیث کی کتاب نہیں ہے اختلافی مسئلہ میں اس کا پیش کرنا ایسا ہے جیسے ہائی کورٹ میں کسی بڑے وکیل کے مقابلہ میں قانون کی کوئی عبارت پیش کی جائے اور کہا جائے کہ یہ عبارت علمی جنتری میں موجود ہے اس پیش کرنے والے کو کس قدر بیوقوف بنایا جائے گا بلکہ پاگل کہہ کر نکلوا دیا جائے گا حالانکہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ علمی جنتری غیر معتبر کتاب ہے اور اس نے قانون کی عبارت میں تحریف کی ہے

اگر ایسا ہوتا تو گورنمنٹ اس سے مواخذہ کیوں نہ کرتی۔ نہ معلوم منکرین حدیث اس تعلیم کے زمانہ میں ایک معمولی دنیاوی مقدمہ میں تو غیر تھا تو فنی کتاب کے حوالہ کو جائز نہیں رکھتے پھر دین کے ایک اہم مسئلہ میں غیر فن حدیث کی کتاب کے حوالہ کو کیسے جائز رکھتے ہیں خصوصاً اس صورت میں کہ اس کے خلاف احادیث صحاح ستہ اور دیگر ان کتابوں میں موجود ہوں جو فن حدیث کی مسلمہ کتابیں ہیں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ پھر اس سے درگزر کر کے ہم کہتے ہیں کہ جن سے یہ روایت نقل کی گئی یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان ہی کا طرز عمل دیکھئے کہ اس کے موافق تھا یا مخالف مسند دارمی میں ہے:۔

كان ابوبكر اذا ورد عليه الخصم	ابوبکر رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ
نظر في كتاب الله فان وجد	جب کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو کتاب اللہ
فيه ما يقضي بينهم قضى به	میں غور کرتے اگر اس میں اس کا حکم
وان لم يكن في الكتاب و	پاتے تو اس کے موافق فیصلہ کر
علم من رسول الله صلى الله	دیتے اور اگر کتاب اللہ میں اس کا حکم نہ
عليه وسلم في ذلك	ملتا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے
الامر سنة قضى به فان	بارہ میں کوئی سنت معلوم ہوتی تو اس کے
اعياه ذلك خرج	موافق فیصلہ کرتے اور اگر اس سے بھی عاجز
فسال المسلمين ۔	ہوتے تو مسلمانوں سے رائے لیتے ۔

یہی طرز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ابن قیم نے بھی اعلام الموقعین میں بحوالہ قضاء ابن عبید نقل کیا ہے۔ اور خلیفہ ہوتے ہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سب سے اول جو خطبہ پڑھا اس میں یہ فرمایا:

یا ایہا الناس قد ولیت	یعنی اے لوگو میں تمہارا والی بنا دیا گیا ہوں
امرکم ولست بخیرکم ولکن	مگر میں تم سب سے افضل نہیں ہوں
نزل القرآن وسن النبی صلی اللہ	بات یہ ہے کہ قرآن نازل ہو چکا
علیہ وسلم السنن فعلمنا	اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طریقے
فتعلمنا۔ ایہا الناس انما	بتا کر ہم کو سکھا دیا ہے۔ اے لوگو میں
انا متبع ولست بمبتدع فان	متبع ہوں موجد (احکام کا) نہیں ہوں
احسنت فاعینونی وان	پس میں اگر ٹھیک چلوں تو میری مدد کرو اور
زغت فقومونی (طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۱۲۹)	اگر میں غلطی کروں تو میری اصلاح کرو۔

اب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اس اصول کی عملی مثالیں ملاحظہ ہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریف کے بعد ہی جب کہ جسد اطہر آنکھوں سے نہاں بھی نہ ہوا تھا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حدیث ہی کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پیش آئی صحابہ میں اختلاف ہوا کہ جسد اطہر کو کہاں دفن کیا جائے کچھ لوگ کہتے تھے مسجد نبوی میں رکھا جائے اور کچھ لوگ کہتے تھے دیگر صحابہ کے قریب دفن کیا جائے اس کا فیصلہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی

نے کہا اور فرمایا میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جہاں پر نبی کی روح قبض ہوتی ہے وہیں دفن کیا جاتا ہے چنانچہ اس کو سب صحابہ نے تسلیم کیا اور جائے وفات یعنی حجرہ حضرت عائشہؓ میں مزار مقدس قرار پایا اور جائے وفات کا فرش اٹھا کر وہیں قبر شریف کھود دی گئی (موطا امام مالک ص۸۰ مطبوعہ دہلی۔ اور ابن ماجہ ذکر وفات شریف ص۱۱۸)

اس قصہ سے نہ صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا تمسک بالحدیث ثابت ہوتا ہے بلکہ تمام صحابہ کا بالاتفاق تمسک بالحدیث ثابت ہوتا ہے کیونکہ سب نے اس کو منظور کیا اور حدیث سننے کے بعد کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا اور اجماع خود دلیل قطعی ہے منکرین حدیث ذرا آنکھ کھولیں۔

دوسرا واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریف کے بعد جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضورؐ کی میراث مانگی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب میں حدیث پیش کی اور فرمایا۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ	یعنی فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
وسلم قال لا نورث ما ترکنا	نے کہ ہماری میراث تقسیم نہیں ہوتی ہم
صدقۃ انما یاکل آل محمد	جو کچھ چھوڑیں وہ صدقہ ہے البتہ اس
(صلی اللہ علیہ وسلم) فی ھذا	مال میں سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا
المال وانی واللہ لا اغیر	کنبہ کھا پی سکتا ہے۔ خدا کی قسم

شیئا من صدقۃ رسول اللہ — ہے کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے
صلی اللہ علیہ وسلم ولا — صدقہ میں کوئی تغیر نہ کروں گا اور
عملن فیہا بما عمل بہ رسول اللہ — میں اس میں وہی کروں گا جو حضور صلی اللہ علیہ
صلی اللہ علیہ وسلم (مسلم ج ۲ صفحہ ۔ بخاری) — وسلم نے کیا ہے یعنی جو فرمایا ہے:

یہ واقعہ بھی صحابہ کے سامنے ہوا اور کسی نے نکیر نہیں کی نہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے لوٹ کر کچھ کہا اس سے روز روشن کی طرح ثابت ہے کہ حدیث تمام صحابہ کے نزدیک حجت تھی۔ منکرین حدیث ہٹ دھرمی کو چھوڑ کر غور کریں۔ ایک اور قصہ سنئے ایک مرتبہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت اپنے پوتے کی میراث مانگنے آئی۔ فرمایا قرآن میں تمہارے حصہ کا ذکر نہیں اور نہ دادی کے حصہ کے متعلق مجھے رسول اللہ علیہ وسلم کا کوئی حکم معلوم ہے اس وقت مغیرہ بن شعبہ موجود تھے اور انہوں نے کہا مجھے معلوم ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دادی کو چھٹا حصہ دلواتے تھے۔ فرمایا کوئی اور شاہد ہے۔ محمد بن مسلمہ نے شہادت دی ان کی شہادت سن کر آپ نے اس عورت کو چھٹا حصہ دلوا دیا (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ صفحہ) یہ روایت اسی تذکرۃ الحفاظ کی ہے جس کی ایک روایت منکرین حدیث نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پیش کی ہے کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپکا فعل اپنے قول کے مخالف تھا یہ بات ایک ادنیٰ مسلمان کیلئے بھی دخل عجیب ہے چہ جائیکہ صحابی کیلئے اور صحابی بھی ابوبکر رض

جیسے جن کی شان خیر الخلائق بعد الانبیاء ہے اس صورت میں توجیہ وہی ہے جس کو ذہبی نے اختیار کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

فهذا المرسل يدل ان مراد الصديق رضي الله عنه التثبت في الاخبار والتحري لا سد باب الرواية الا تراه لما نزل به امر الجدة ولم يجده في الكتاب كيف سأل عنه في السنن فلما اخبره الثقة ما اكتفى حتى استظهر بثقة آخر ولم يقل حسبنا كتاب الله كما تقوله الخوارج

(تذکرۃ الحفاظ ج ص۳)

یعنی اس مرسل روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ مقصود حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا حدیثوں کی روایت میں احتیاط اور سوچ سمجھ سے کام کرنا ہے نہ کہ باب روایت کو بالکل بند کرنا۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ جب آپ کے سامنے دادی کی میراث کا قضیہ پیش ہوا اور انہوں نے اس کا حکم کتاب اللہ میں نہ پایا تو اس کے متعلق کس طرح حدیث کو حجت سمجھا اور جب ان کو ایک معتبر آدمی (حضرت مغیرہ بن شعبہ صحابی) نے خبر دی تو اس پر ہی بس نہیں کیا حتیٰ کہ دوسرے ایک معتبر آدمی (حضرت محمد بن مسلمہ) سے اس کی تصدیق کر لی اور یہ نہیں کہہ دیا کہ ہم کو کتاب اللہ کافی ہے جیسے خوارج کہتے ہیں۔

ہمارے بھائیوں نے کیسی کتر بیونت کی ہے کہ تذکرۃ الحفاظ میں سے صرف اپنے مطلب کی روایت لے لی اور خود اسی کتاب میں کی دوسری روایت جو اپنے خلاف تھی اور مصنف کی تطبیق کو چھوڑ دیا۔

اب منکرین حدیث کی دوسری روایت سنئے وہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پانچ سو حدیثوں کا مجموعہ تیار کیا تھا ایک رات میں آپ بہت بے چین رہے اس سے حضرت عائشہؓ پریشان ہوئیں اور سبب پوچھا صبح کو فرمایا کہ بیٹی وہ حدیث کا مجموعہ لے آؤ وہ لائیں آپ نے اس کو جلا دیا حضرت عائشہؓ نے پوچھا کہ ایسا کیوں کیا فرمایا مجھے خوف معلوم ہوا کہ میں مر جاؤں اور یہ مجموعہ رہ جائے ممکن ہے کہ میں نے اس میں ایسے لوگوں سے حدیثیں لی ہوں جن کو میں امین سمجھتا ہوں اور مجھے ان پر وثوق ہے لیکن وہ حدیثیں واقع میں ایسی نہ ہوں (تذکرۃ الحفاظ ذکر ابوبکرؓ) یہاں بھی ہمارے بھائیوں نے خیانت علمی سے کام لیا جس تذکرۃ الحفاظ سے اس کو نقل کیا ہے اسی میں آگے لکھا ہے:-

لا یصح ذلک (تذکرۃ الحفاظ ج اص ۵) یعنی یہ روایت صحیح نہیں۔

؎ آفریں باد بریں ہمت مردانہ تو

ایسے متفقہ مسئلہ کی مخالفت اور اس کی بنا تاریخ کی کتاب پر اور اس میں بھی خیانت اس روایت کا راوی ابراہیم بن عمر بن عبید اللہ التیمی ہے جو

مجہول ہے اس کا اسماء رجال میں پتہ نہیں۔

منکرینِ حدیث کی تیسری دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

حسبنا کتاب اللہ   یعنی ہم کو کتاب اللہ کافی ہے

اور آپ حدیثوں کی اشاعت سے لوگوں کو روکتے تھے چنانچہ قرظہ بن کعب راوی ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہم لوگوں کو عراق بھیجا تو خود ہماری مشایعت کے لئے نکلے اور ہم سے پوچھا کہ تم کو معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیوں آیا ہوں لوگوں نے عرض کیا ہماری عزت افزائی کے لئے۔ فرمایا ہاں لیکن یہ بھی غرض ہے کہ تم لوگ ایسے مقام پر جاتے ہو جہاں کے باشندوں کی آوازیں قرآن پڑھنے میں شہد کی مکھیوں کی آواز کی طرح گونجتی رہتی ہیں تم ان کو احادیث میں مشغول کر کے قرآن سے غافل نہ کر دینا قرآن میں آمیزش نہ کرو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کم روایت کرو میں تمہارا شریک ہوں قرظہ جب عراق پہنچے تو لوگوں نے کہا ہم سے حدیث بیان کرو انہوں نے کہا ہم کو حضرت عمرؓ نے منع کیا ہے (تذکرۃ الحفاظ جلد اول صفحہ ۶)

ان روایتوں کی نسبت بھی اولاً ہم کو یہ کہنا ہے کہ یہ روایتیں تذکرۃ الحفاظ کی ہیں جو حدیث کی کتاب نہیں اس کو استدلال میں بمقابلہ صحاح کے پیش کرنا، ویسا ہی ہے جیسے علمی جنتری یا کسی بازاری ڈائری کو ہائی کورٹ

میں کسی بڑے وکیل کے مقابلہ میں پیش کرنا (اور ثانیاً یہ کہ حسبنا کتاب اللہ
سے یہ مطلب کیسے نکلا کہ حدیث حجت نہیں اس کا یہ مطلب بھی تو ہو سکتا
ہے کہ اگر کوئی شخص ایک حدیث بیان کرے اور وہ کتاب اللہ کے معارض
ہو تو کتاب اللہ کو ترجیح دی جائے گی بمقابلہ کتاب کے اس حدیث کی
حاجت نہیں۔ اور قصہ قرظہ بن کعب سے عدم حجیت حدیث پر استدلال
کرنا قابلِ مضحکہ بات ہے اس صورت میں اس لفظ کا کیا مطلب ہو گا۔ کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کم روایت کرو اگر حضرت عمر حدیث کو
مطلقاً حجت نہیں سمجھتے تھے اور روایت حدیث کو گناہ جانتے تھے تو
اس کے یہ معنے ہوں گے کہ تھوڑے گناہ کی اجازت ہے یہ کیا جہالت
ہے تعجب ہے جن کے ایسے دماغ اور یہ قابلیتیں ہیں وہ علماء کے
مقابلہ کے لئے میدان میں آتے ہیں۔ اس روایت سے تو صاف یہی
ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مطلب روایت حدیث
کے بارہ میں احتیاط کرنا ہے نہ کہ مطلقاً باب روایت کو مسدود کرنا
اور حدیث کا کلیتہً ناقابلِ حجت سمجھنا چنانچہ اس پر ان کا خود کا طرزِ عمل روشنی
ڈالتا ہے جیسا کہ آگے آتا ہے۔ اور یہ لفظ کہ ان کی آوازیں قرآن پڑھنے
میں شہد کی مکھیوں کی طرح گونجتی ہیں تم ان کو حدیث کے مشغلہ میں لگا کر
قرآن سے غافل نہ کرو دینا صاف بتا رہا ہے کہ حضرت عمر نے اس کو

سلہ مخالفت ۱۲

غنیمت سمجھا کہ عراق کے لوگ باوجود نومسلم ہونے کے قرآن شریف کے بہت دلدادہ ہیں اور تعلیم قرآن کا ان میں چرچا ہوگیا ہے اگر اس وقت وہ دوسرے مشغلے میں لگ گئے تو اس سے جاتے رہیں گے تو یہ منع کرنا بعینہ ایسا ہوا جیسے ایک قرآن حفظ کرنے والے لڑکے کو کہا جائے کہ تم اردو فارسی عربی فقہ حدیث تفسیر کسی فن کی کتاب مت دیکھو کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ فنون ممنوع اور بیکار ہیں اور ان کا حاصل کرنا گناہ ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس وقت حفظ قرآن کے ساتھ ان علوم کے طرف توجہ کرنا حفظ قرآن کے لئے مضر ہے۔ اور یہ لفظ کہ قرآن میں آمیزش نہ کرو نیز اسی کی مزید تاکید کرتا ہے مطلب یہ ہے کہ اس وقت حدیث کے مشغلہ میں ان کو ڈال دینے سے یہ بھی اندیشہ ہے کہ قرآن وحدیث میں خلط ملط کرنے لگیں۔ غرض یہ کہ اس تذکرۃ الحفاظ کی روایت کو مخالفین حدیث نے اپنے لئے مفید سمجھا حالانکہ وہ ہمارے لئے مفید ہے اور اس سے دوسری روایتوں کی توجیہ بھی صاف صاف ہوجاتی ہے جن کو مخالفین پیش کرتے ہیں مثلاً یہ کہ ابوسلمہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا تم اسی طریقہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی حدیثیں بیان کرتے تھے انہوں نے کہا اگر میں ان کے زمانہ میں اس طرح حدیثیں بیان کرتا تو وہ مجھ کو دُرّے سے مارتے (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ صفہ ٦) یا یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

عبداللہ بن مسعود و ابو درداء ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہم کو کثرت روایت کے جرم میں قید کر دیا تھا (تذکرۃ الحفاظ ج ۱ صے) یا یہ کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں بیان کرتے تھے۔ سلمان فارسی نے کہا کہ تم باز آؤ ورنہ میں حضرت عمر کو لکھوں گا۔ (ابو داؤد) اسی قبیل کی شاید کچھ اور روایتیں بھی مخالفین کے پاس ہوں گی ان سب روایتوں کی توجیہ قرظہ بن کعب کی روایت سے ہو جاتی ہے کہ مراد احتیاط فی الروایۃ ہے نہ کہ سد باب روایۃ چنانچہ ابو مسعود انصاری والی روایت میں لفظ کثرت روایت کا ہے نہ مطلق روایت کا۔ اب ہم اس بحث کو طول نہیں دیتے اور

العاقل تکفیہ الاشارۃ — عاقل کو اشارہ کافی ہے اور جاہل کو

والجاهل لا تكفيه الصراحۃ — صراحت بھی ناکافی۔

کہہ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طرز عمل بیان کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طرز عمل بھی یہی رہا کہ کتاب اللہ کے بعد سنت کی طرف رجوع کرلے بلکہ انہوں نے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سنت ابی بکر کو بھی شامل کیا اس وجہ سے کہ ان کو پورا اعتماد تھا کہ یہ بھی سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پہ مبنی ہوتی ہے چنانچہ انہوں نے خود اپنے طرز عمل کو ان الفاظ سے بیان فرمایا

ہے:-

انه مضى لي صاحبان يعني النبي صلى الله عليه وسلم وابا بكر عملا عملاً وسلكا طريقاً فاني ان عملت بغيرها سلكت لي غير طريقهما

(طبقات ابن سعد جزو ۳ ق ا صفحہ ۲۲۷)

میرے دو ساتھی یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر آگے جا چکے اور ان دونوں حضرات نے ایک طرز عمل رکھا اور ایک طریقہ مقرر کیا ہیں اگر دونوں کے علاوہ کسی دوسرے طرز عمل پر چلوں گا تو وہ طرز عمل مجھ کو ان کے طریقہ سے جدا کر دے گا (یعنی وہ بدعت ہوگا)

اس میں انہوں نے اپنے لئے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سنت ابی بکر رضی اللہ عنہ دونوں کی پیروی ضروری قرار دی اور حافظ ابن القیم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے طریقہ کو جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے لکھنے کے بعد تحریر کرتے ہیں:-

وكان عمر يفعل ذلك فاذا اعياه ان يجد ذلك في كتاب الله والسنة سأل هل كان ابو بكر قضى فيه بقضاء فان

یعنی حضرت عمر بھی ایسا ہی کرتے تھے (یعنی علی الترتیب کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کرتے تھے) اور جب کتاب اللہ اور سنت میں کچھ نہ ملتا تو لوگوں سے

كان لابي بكر قضاء قضى به والا جمع علماء الناس واستشارهم فاذا اجتمع رايهم على شئ قضى به

(اعلام الموقعین ج ۱ صفحہ)

پوچھتے کہ ایسا کوئی قضیہ حضرت ابوبکر کے سامنے بھی ہوا اور اس میں انہوں نے کیا فیصلہ کیا اگر ایسا کوئی فیصلہ مل جاتا تو اسی کے موافق یہ بھی کرتے ورنہ علماء کو جمع کرکے مشورہ کرتے جب ان کی رائے کسی بات پر متفق ہو جاتی تو اس کے موافق حکم دیتے

لیجئے حضرت عمر نے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سنت ابی بکر بھی قائم کر دی۔ منکرین حدیث غور کریں۔

اور حضرت عمر قضاۃ کو عہدۂ قضا پر مقرر کرتے وقت خاص طور سے کتاب اللہ اور اس کے بعد سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق فیصلہ کرنے کی ہدایت فرماتے چنانچہ جب تاریخ اسلام کے مشہور قاضی شریح کو کوفہ کا قاضی مقرر کیا تو ہدایت کی:

انظر ما يتبين لك في كتاب الله فلا تسائل عنه احدا وما لم يتبين لك في كتاب الله فاتبع فيه سنة رسول الله صلى الله عليه

یعنی غور کرو اگر تم کو کتاب اللہ میں مل جائے تو کسی سے اس کے متعلق مت پوچھو اور جو حکم کتاب اللہ میں نہ ملے تو اس میں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرو

وسلم وما لم يتبين لك فيه السنة فاجتهد فيه رايك (اعلام الموقعين ج ا ص ۷۱)

اور جس حکم کے متعلق تم کو سنت بھی نہ ملے تو اس میں اجتہاد کرو۔

حضرت عمر کا یہی طرز عمل رہا یہاں تک کہ بروقت شہادت یہ دعا کی:-

اللهم انی اشهدك على امراء الامصار فانی انما بعثتهم ليعلموا الناس دينهم وسنة نبيهم ويعدلوا عليهم ويقسموا فيهم بينهم ويرفعوا الی ما اشكل عليهم من امرهم (ابن سعد ج ۳ ق ا صفحہ ۲۴۳)

یعنی اے اللہ میں آپ کو ملکوں کے حکام پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے ان کو اس واسطے بھیجا تھا کہ وہ لوگوں کو ان کا دین اور ان کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سکھاتیں اور ان میں انصاف کریں اور مال غنیمت کو ان کے درمیان تقسیم کریں اور انہیں جو الجھن پیش آئے اس کو میرے سامنے پیش کریں۔

اس سے صاف ثابت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود بھی سنت کو حجت سمجھتے تھے اور تمام ممالک میں اس کی تبلیغ و تعلیم کو اپنا فرض منصبی جانتے تھے۔

شیبہ راوی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب کہ وہ میرے پاس مسجد حرام میں بیٹھے تھے فرمایا کہ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ تمام سونا

چاندی مسلمانوں میں تقسیم کر دوں گا اور اس گھر (کعبہ) میں کچھ نہ رکھوں گا میں نے کہا تم کو اس کا کیا حق ہے انہوں نے کہا کیوں میں نے کہا اس واسطے کہ آپ کے دونوں پیشرووں (حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ) نے ایسا نہیں کیا۔ کہا میں ان ہی دونوں حضرات کی اقتدا کرتا ہوں (بخاری باب الاقتدا بالسنن ج ۲ صفحہ ۱۰۸) ابن مسیّب راوی ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انگلیوں کے قطع کی دیت میں ایک بار کوئی فیصلہ کیا اس کے بعد اس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک حکم کا حوالہ دیا گیا جو حضورؐ نے ابن حزم کو لکھا تھا تو حضرت عمرؓ نے اپنا پہلا فیصلہ فوراً منسوخ کر دیا (سیرۃ ابن الخطاب ابن جوزی صفحہ ۱۲۵)

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ایک مجنونہ زانیہ عورت کو سنگسار کرنا چاہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے کہا کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ تین شخص مرفوع القلم[1] ہیں (۱) سونے والا جب تک بیدار نہ ہو جائے۔ (۲) بچہ جب تک بالغ نہ ہو جائے (۳) مجنون جب تک ہوش میں نہ آجائے۔ یہ حدیث سن کر حضرت عمرؓ نے اس عورت کو چھوڑ دیا (مسند احمد بن حنبل ج ۱ صفحہ ۱۴۰)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کو بوسہ دیا پھر فرمایا میں جانتا ہوں کہ تو کسی کو کوئی فائدہ یا نقصان نہیں پہنچا سکتا لیکن چونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ

---

[1] جن سے مواخذہ نہیں ۱۲

علیہ وسلم نے تجھ کو بوسہ دیا ہے لہذا میں بھی دیتا ہوں (مسلم و بخاری کتاب المناسک)
منکرین حدیث غور کریں کہ جو شخص اتباع سنت پر اس قدر حریص ہو کہ باوجود
طبیعت کے خلاف ہونے کے محض اتباع سنت کے لئے حجر اسود کو بوسہ
دے وہ حجیت حدیث کا منکر کیسے ہوگا۔ ذرا تو ہوش سے کام لینا چاہیئے
غور کرنے کی بات ہے کہ حج کے مناسک تعداد میں اس قدر ہیں کہ حج کرنے
والے سب کام چھوڑ کر ان کے پیچھے پڑتے ہیں کھانے پینے کا ہوش بھی ڈھنگ
سے نہیں رہتا تب وہ پوری ہوتی ہیں ان میں سے قرآن میں بہت تھوڑی
مذکور ہیں سب احادیث ہی سے ثابت ہیں اور صحابہ سے لے کر آج تک
جاری ہیں کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تمام صحابہ اور سلف و خلف سب
حجیت حدیث کے قائل تھے۔ ابن عمر وغیرہ بعض حریص علی الطاعۃ صحابہ
کی یہ حالت تھی کہ حج کے موقع پر جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدل چلے تھے
وہاں پیدل چلتے جہاں سوار ہوئے وہاں سوار ہوتے جہاں بیٹھے وہاں بیٹھتے۔
یہ سب حجیت حدیث کے قائل ہونے کی دلیل ہے یا کچھ اور؟

اکثر ایسا ہوتا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب کوئی صورت پیش آتی تو
مجمع عام میں کھڑے ہو کر پوچھتے کہ اس صورت کے متعلق کسی کو کوئی حدیث معلوم
ہے۔ تکبیر جنازہ، غسل میت، جزیہ مجوس اور اس قسم کے صدہا مسائل
کے متعلق آپ نے صحابہ سے پوچھ کر احادیث کا پتہ لگایا جن کی تفصیل کتب

حدیث میں مذکور ہے البتہ بلا پوری تحقیق کے کسی روایت کو قبول کرنے میں جلدی نہ کرتے تھے۔ یہ ہے بنا ان روایتوں کی جن کو منکرین حدیث پیش کرتے ہیں ورنہ کوئی صاحب بتائیں کہ شیخین جیسے اکابر کے قول و فعل میں اس قدر تخالف کیوں ہے جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور جن کی شان ہے:-

لو کنت متخذاً خلیلا — اگر میں انسانوں میں سے کسی کو دوست
من الناس لاتخذت — بناتا تو ابوبکر کو بناتا
ابابکر خلیلا۔

اور :-

لو کان بعدی نبی — اگر میرے بعد نبی ہو سکتا تو عمر
لکان عمر — ہوتا۔

غرض حضرات شیخین کی نسبت یہ کہنا کہ وہ حدیث کو ناقابلِ حجت سمجھتے تھے محض جہالت اور تلبیس اور افتراء ہے اسی طرح یہ کہنا کہ خود صحابہ اور ائمہ نے بعض حدیثوں کی نسبت بری رائے ظاہر کی محض عوام کو دھوکا دینا ہے۔ صحابہ اور تمام ائمہ عاشقِ رسولؐ تھے جن کے عشق کے قصے تمام دنیا کی زبانوں پر ہیں۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خچر پر سوار ایک مقام پہ کھڑے تھے خچر نے پیشاب کیا عبداللہ بن ابی منافق بھی قریب کھڑا تھا پیشاب کی بد

سے ناک چڑھانے لگا تو ایک صحابی بے ساختہ کہتے ہیں کہ تیرے مشک سے اس کی بو اچھی ہے۔ ائمہ کے بعض قصے ہم لکھ آئے ہیں مثلاً امام مالک صاحب کا قصہ احترام حدیث کے متعلق کہ غسل کر کے کپڑے بدل کر ایک حدیث سناتے تھے اسناد روایت حدیث میں بچھو نے کئی جگہ کاٹا مگر لہجہ تک نہیں بدلا۔ امام بخاری صاحب نے ایک ایک حدیث کو غسل کر کے لکھا ہے۔ ان حضرات کی نسبت یہ کہنا کہ حدیث کی نسبت بری رائے ظاہر کی کس قدر دریدہ دہنی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اول تو اس کی کوئی اصلیت نہیں اور اگر کسی نے کوئی لفظ سخت منقول ہوا تو کسی موضوع حدیث کی نسبت ہوگا جس میں سے ہمارے مہربانوں نے تراش خراش کی عادت کے بموجب موضوع کا لفظ اڑا دیا اور حدیث کا رہنے دیا۔ یہ قاعدہ ہے کہ عاشق کو جس درجہ میں محبوب کی ہر بات اچھی معلوم ہوتی ہے محبوب کے خلاف بات اسی درجہ میں بری لگتی ہے یہی وجہ ہے کہ محدثین کسی راوی کے متعلق کچھ شبہ پاتے تو دجال۔ مدلس۔ کذاب جعفری وغیرہ سخت لفظ استعمال کرنے لگتے تھے اسی عادت کے موافق کسی موضوع حدیث کی نسبت کسی امام نے کوئی سخت لفظ کہہ دیا ہو تو عجب نہیں جس کو ہمارے مخاطبین لے کر ہلدی کی گرہ سے پنساری بن بیٹھے۔

اور اہل تشکیک کی طرف سے کہا گیا ہے کہ حدیث کی تدوین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی صدی کے بعد ہوئی۔ یہ صریح کذب ہے جس کو سفید جھوٹ

کہنا چاہیے علماء نے اس کے متعلق مستقل باب باندھے ہیں جو ہمارے مولوی صاحب کی نظر سے بھی ضرور گذرے ہوں گے لیکن افسوس ہے کہ چاند پر خاک ڈالی گئی ہے۔ اور یہ صریح جھوٹ بولا گیا ہے۔ حدیث کی کتابت تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک ہی میں شروع ہو گئی تھی لیکن بمصلحت حفاظت قرآن کے عام طور سے لکھنے کو روک دیا گیا تھا۔ کتابت حدیث کا ثبوت ہم ابھی اوپر بیان کر آئے ہیں کہ ابو شاہ یمنی کے واسطے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثیں لکھوائی تھیں اور عبد اللہ بن عمرؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے حدیثیں لکھتے تھے۔ اور رافع بن خدیجؓ نے تصریحاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لکھنے کی اجازت لے لی تھی حضورؐ کے لفظ یہ ہیں

اکتبوا ذلک ولا حرج — اس کو لکھو اور کچھ حرج نہیں۔

اکتبوا صیغہ جمع ہے جس سے نہ صرف رافع بن خدیج کے لئے اجازت نکلتی ہے بلکہ جملہ لکھنے والوں کے لئے ثابت ہوتی ہے ہم اس بحث کو اوپر کسی قدر بسط کے ساتھ لکھ آئے ہیں۔ یہاں ہم کو اس کا جھوٹ ہونا ثابت کرنا ہے کہ تدوین حدیث کئی صدی کے بعد ہوئی۔

مقدمہ فتح الباری میں ہے۔

اول من جمع ذلک الربیع — سب سے پہلے جس نے حدیثوں کو

ل کل ذلک منقول عن اوجز المسالک شرح موطا امام مالک ج ۱ ص ۱۲ منہ

بن صبیح و سعید بن	جمع کیا (تدوین حدیث کی کی) ربیع بن صبیح
عروبۃ فکانوا یصنفون	اور سعید بن عروبہ ہیں یہ حضرات ہر باب کو
کل باب علیحدۃ الی ان	علیحدہ علیحدہ لکھتے تھے یہاں تک کہ طبقہ
قام کبار اھل الطبقۃ	ثالثہ یعنی تبع تابعین کے جلیل القدر علماً
الثالثۃ فی منتصف القرن	نصف قرن ثانی کے قریب کھڑے ہوئے اور
الثانی فدونوا الاحکام	انہوں نے حدیث کی تدوین کے ساتھ احکام کی تدوین
فصنف الامام مالک الموطا	بھی کی (یعنی ابواب فقہ کے موافق ترتیب احادیث کی)

[illegible] تصنیف کی

آگے فرماتے ہیں :۔

وصنف ابن جریج بمکۃ	ابن جریج اور اوزاعی اور ثوری
والاوزاعی بالشام و	اور حماد بن سلمہ اور ہشیم اور معمر
الثوری بکوفۃ وحماد بن	اور ابن مبارک اور جریر بن عبد الحمید
سلمۃ یا بصرۃ وھشیم	نے علی الترتیب مکہ اور شام اور
بواسط ومعمر یالیمن و	کوفہ اور بصرہ اور واسط اور
ابن المبارک بخراسان و	یمن اور خراسان اور ری میں اسی
جریر بن عبد الحمید بالری	قسم کی حدیث کی تصنیفیں کیں اور یہ سب
وکان ھولاء فی عصر واحد	حضرات ایک ہی زمانہ میں تھے ۔

امام مالک صاحب کی ولادت ۹۳ھ میں اور وفات ۱۷۹ھ ہجری میں ہوئی

اور مسند ارشاد اور درس پہ سترہ[۱۷] سال کی عمر میں بیٹھے یعنی سنہ ۱۱۱ھ ہجری میں
اور حضرت امام نے اپنے ہاتھ سے ایک لاکھ حدیثیں لکھیں اور بعد وفات
ان کے گھر میں سے متعدد صندوق حدیث کی تحریروں کے نکلے۔ ظاہر ہے کہ
یہ سب حدیثیں اور موطا اور جملہ تصانیف حضرت امام مالک کی مابین سنہ ۱۱۱ھ
اور سنہ ۱۷۹ھ کے ہوئیں اور اسی زمانہ میں ابن جریج اور اوزاعی اور دیگر ائمہ
مذکورین کی تصانیف بھی ہوئیں پھر یہ کہنا کہ علم حدیث کی تدوین صدیوں کے
بعد ہوئی جھوٹ نہیں تو کیا ہے یا ہمارے بھائی ایک صدی کو صدیوں کہا
کرتے ہیں۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بھی ایک کتاب مستقل کتاب الآثار
فن حدیث میں موجود ہے جس میں ان سے امام محمد صاحب نے حدیثوں
کو روایت کیا ہے امام ابو حنیفہ کی ولادت سنہ ۸۰ھ ہجری میں اور
وفات سنہ ۱۵۰ھ میں ہے جملہ تصانیف امام ممدوح کی مابین سنہ ۸۰ھ و
سنہ ۱۵۰ھ کے ہوئیں اس پر بھی اطلاق صدیوں کا نہیں ہو سکتا اور کہا
گیا ہے کہ بعض حدیثیں ایسے صحابہ سے مروی ہیں جن کو قرآن نے
مردود الشہادت قرار دیا ہے۔

یہاں سے منکرین حدیث کی جہالت ثابت ہوتی ہے۔ اول تو یہ کہ
ایسے صحابہ تعداد میں کتنے ہیں وہ صرف تین حضرات ہیں جو بھولے پن کی
وجہ سے قصہ افک میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے متعلق منافقین کی ہا

میں ہاں ملا بیٹھے تھے۔ لیکن ان حضرات نے پھر تو یہ کی اور ان کے متعلق گو قانونی حکم یہی ہے کہ ان کی شہادت تمام عمر قبول نہ کی جاوے۔ لیکن ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ عدم قبول شہادت اور اور عدم قبول روایت ایک ہی چیز ہیں یا دو۔ کیا یہ نہیں سنا کہ باپ کی شہادت بیٹے کے واسطے اور بالعکس اور غلام کی شہادت مولیٰ کے لئے اور اسی طرح کی چند شہادتیں نامقبول ہیں تو کیا اس سے ان کی جملہ روایتیں بھی مردود ہوجائیں گی تو اس بناپر تو ہر شخص مردود الروایت ہے کیونکہ وہ کسی کا بیٹا اور کسی کا باپ ضرور ہے اور اس کے بارہ میں مردود الشہادت ہے۔ یہ پہیلی ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ ہمارے بھائیوں نے شرعی کتابیں نہیں پڑھیں تو انگریزی قانون کا مطالعہ تو کیا ہوگا ان کو معلوم ہوگا کہ جس واقعہ میں ایک مجسٹریٹ خود ماخوذ ہو اس مقدمہ کا فیصلہ وہ نہیں کر سکتا بلکہ یہ فیصلہ کوئی دوسرا مجسٹریٹ کرے گا تو اس قانون کی رو سے اس مقدمہ کے بارہ میں پہلا مجسٹریٹ مردود الحکم ہے تو کیا اس کے یہ معنے ہیں کہ وہ مجسٹریٹ مطلقاً مردود الحکم ہے اور کسی مقدمہ میں بھی حکم نہیں کر سکتا۔ یہ کون سی منطق ہے۔ اسی طرح شہادت کے نامقبول ہونے کو روایت کا نامقبول ہونا لازم نہیں۔ پھر یہ کہ اگر کسی بیوقوف کی خاطر سے اس کا لزوم مان بھی لیا جائے تو یہ کس اصول پر مبنی ہے کہ ایک دو

افراد کا کوئی حکم لاکھوں افراد پہ جاری کہہ دیا جائے وہ صحابہ جن کو نامقبول الشہادت کہا گیا ہے تین سے زیادہ نہیں ہیں اور وہ متعین ہیں ان کے نام معلوم ہیں۔ بطور فرضِ محال اس لزوم کو مانتے ہوئے بھی غایت[1] مافی الباب صرف ان ہی تین کی روایت غیر مقبول کہی جا سکتی ہے نہ کہ سب کی۔ ایک ضلع کے یا ایک صوبہ کے مقدمات عدالت میں پیش ہوتے ہیں بعض وقت کسی گواہ کا جھوٹا ہونا ثابت ہو جاتا ہے تو کیا یہ بھی کوئی قانون ہے کہ اس ضلع کے یا اس صوبہ کے تمام آدمیوں کو جھوٹا کہہ دیا جائے قانون تو یہ ہے کہ اگر ایک گھر میں بھی دس آدمی رہتے ہیں اور ان میں سے نو (۹) اشخاص کا جھوٹ بھی ثابت ہو گیا تو دسویں کو جھوٹا نہیں کہا جا سکتا اگر کوئی اس کو جھوٹا کہے گا تو اس پہ توہین اور ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ چل جائے گا۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ قانون والوں کے دماغ صحابہ کی نسبت ایسے کیوں خراب ہوتے ہیں کہ ایک دو (۲) افراد کی شہادت نامقبول ہونے سے لاکھوں صحابہ کی شہادت بلکہ روایت کو نامقبول کہہ دیا سہ

بریں عقل و دانش بباید گریست

اور اہل تشکیک کی طرف سے کہا گیا ہے کہ حدیثوں میں بہت سی موضوع حدیثیں بھی ہیں۔ لہٰذا جملہ احادیث قابل اعتبار نہ رہیں۔ اس کا بھی وہی جواب ہے کہ بعض کا حکم کل کی طرف کیسے متعدی ہو گیا اس کی نظیر

---

[1] زیادہ سے زیادہ۔

وہی ہے کہ ایک دو افراد کے جھوٹے ہونے سے تمام ملک یا ایک ضلع یا ایک شہر یا ایک گھر کے آدمیوں پر جھوٹے ہونے کا حکم نہیں ہو سکتا۔ علماء نے فن حدیث کو انتہائی کمال تک پہنچا دیا ہے موضوعات کو الگ، ضعیف حدیثوں کو الگ، متواتر کو الگ، خبر آحاد کو الگ، حسن کو الگ، غریب کو الگ، موقوف کو الگ، مرفوع کو الگ، مرسل کو الگ، مسند کو الگ، منقطع کو الگ کر کے رکھ دیا ہے پھر جب کہ ہر قسم کی حدیثیں الگ الگ ہیں تو موضوعات کا حکم غیر موضوعات پر کیسے جاری ہوگا لطف یہ ہے کہ تاریخ کا اعتبار کیا جاتا ہے جس میں صحیح اور غیر صحیح کا کوئی معیار ہی نہیں روایت میں سند نہیں مورخین میں تقوے و دیانت نہیں خود ماہرین فن تاریخ کے اقوال سے ثابت ہے کہ تاریخ میں صرف روایت نہیں ہوتی بلکہ مورخ کی رائے بھی شامل ہوتی ہے۔ تاریخ کو حدیث سے کیا نسبت ہے:

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

حیف ہے کہ جس میں صحیح و سقیم کا کوئی معیار نہ ہو اس کا اعتبار کیا جائے اور جس میں صحیح و سقیم و قوی، ضعیف سب جدا جدا ہوں اس کے صحیح کو بھی سقیم کے تابع کر کے چھوڑ دیا جائے الغرض ہم نے اس بحث میں منکرین حدیث کے استدلالات پر کافی روشنی ڈال دی اور بتا دیا کہ کتابت حدیث سے قرن اول میں اور خلفاء کے زمانہ میں منع کیا جاتا کیا

حقیقت رکھتا ہے اور اس کے متعلق ہمارے بھائیوں نے کیا کیا غلطیاں اور علمی خیانتیں اور تحریفیں کی ہیں اور یہ کہ بعض احادیث پر صحابہ سے یا ائمہ حدیث سے انکار سن کر یا بعض موضوعات کو دیکھ کر کل احادیث کو غیر معتبر کہہ دینا کہاں تک درست ہے۔ اور یہ غلط ہے کہ احادیث زمانۂ رسالت سے صدیوں کے بعد لکھی گئیں۔

اب ایک ذرا سا شبہ اور باقی ہے وہ یہ ہے کہ احادیث کے مضامین میں بعض اوقات اختلاف ہوتا ہے تو مختلف احادیث میں سے کس پر عمل کیا جائے لہذا سہولت اس میں ہے کہ اذا تعارضا تساقطا یعنی دو متعارض چیزوں میں سے ایک کو بھی نہ ماننا چاہئے اس کا جواب یہ ہے کہ اختلاف تاریخ میں بھی ہے پھر تاریخ کو بھی چھوڑ دینا چاہئے - لیکن تاریخ کو نہیں چھوڑا جاتا کیونکہ تمدنی اور ملکی اور معاشرتی اور ہر قسم کے تجربے تاریخ ہی سے حاصل ہوتے ہیں جن پہ دنیاوی مضرتوں سے بچنا اور منفعتوں کو حاصل کرنا موقوف ہے اسی طرح دین کو اختلاف کی وجہ سے چھوڑ دینا کیسے درست ہوگا جب کہ تمام اخروی مضرتوں سے بچنا اور منافع کو حاصل کرنا دین پر موقوف ہے اور دین حدیث پر موقوف ہے جیسا کہ ہم نقلاً وعقلاً پہلے ثابت کر آئے ہیں - جس طرح باوجود اختلاف کے تاریخ سے کام لیا جاتا ہے اسی طرح باوجود اختلاف کے حدیث سے بھی کام نکال سکتے ہیں چنانچہ

علماء نے بھی کیا ہے اور وہ اصول وقواعد مرتب کئے ہیں جو سراسر عقل و انصاف کے مطابق ہیں تمام علمِ اصول حدیث اور علم اصول فقہ اسی سے بھرا ہوا ہے علمِ اصول حدیث میں حدیث کے اقسام کا بھی علم ہے جس سے حدیث کے مراتب معلوم ہوتے ہیں تاکہ اختلاف کے وقت قوی کو ضعیف پر ترجیح دی جاسکے اور اصول فقہ میں حدیث سے مسائل کے استنباط کے قواعد ہیں تاکہ درجہ احکام کا محفوظ رہے مثلاً حدیث متواتر[1] سے فرضیت ثابت ہوتی ہے اور خبر آحاد سے وجوب ثابت ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ جن کی تفصیل کتابوں میں ہے اور ہم کہتے ہیں کہ اختلاف تو ہر چیز میں ہے دیکھئے اسباب معیشت جن کی ہم کو ہر وقت ضرورت ہے ان میں کس قدر اختلاف ہے پانی کوئی اچھا ہے کوئی برا کوئی اعلیٰ درجہ کا ہے کوئی ادنیٰ درجہ کا ہوا کہیں کی اچھی ہے کہیں کی بری اناج کہیں کا اچھا ہے کہیں کا برا۔ تو کیا اذا تعارضا تساقطا پر نظر کرکے اسباب معیشت کو بالکل ترک کر دینا چاہیئے بعض چیزوں میں ایسا اختلاف ہے کہ اس کو رفع کیا ہی نہیں جا سکتا مثلاً بیماری میں علاج کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کے لئے مختلف قسم کی طبیں موجود ہیں یونانی ڈاکٹری ہومیوپیتھک، ویدک وغیرہ لیکن ان میں باہم اختلاف اس قدر ہے کہ اس کو دیکھتے ہوئے کوئی علاج ہی اختیار نہیں کیا جا سکتا ایک طب کہتی ہے کہ علاج بالضد ہونا چاہیئے ظاہر ہے کہ

---

[1] حدیث متواتر وہ ہے جس کو ہر زمانہ میں بکثرت روایت کیا گیا ہو اور خبر آحاد وہ ہے جس کو چند افراد نے روایت کیا ہو ۱۲

آگ سے جل جائے تو پانی ڈالنا چاہیے کیونکہ پانی آگ کو بجھاتا ہے دوسری طب کہتی ہے کہ علاج بالمثل ہونا چاہیئے آگ سے جلے کو آگ ہی سے سینکتے ہیں یا چونا لگاتے ہیں تو نفع ہوتا ہے اور چونا گرم ہے۔ ایک طب کہتی ہے کہ سمیات کے پاس نہ جانا چاہیے کیونکہ وہ جوہر اعضاء اور روح کو خراب کرنے والے ہیں دوسری طب کہتی ہے کہ جملہ امراض کا علاج سمیات ہی سے کرنا چاہیے ان ہی سے امراض دفع ہوتے ہیں اور ان ہی سے طاقت آتی ہے گویا فساد اعضاء اور ارواح کا دفعیہ ان ہی سے ہوتا ہے۔ ایک طب رفع اسہال کے لئے افیون کو مفید بتاتی ہے دوسری طب افیون کو دفع قبض کے لئے تجویز کرتی ہے ہم پوچھتے ہیں کہ اس صورت میں کیا کرنا چاہئے ان تحقیقات میں ایسا تعارض ہے کہ حدیث میں کہیں بھی ایسا تعارض نہیں پس اگر اذا تعارضا تساقطا پر عمل کیا جاتے تو کسی مرض کا بھی علاج نہ کرنا چاہیے مگر دنیا میں کوئی بھی ایسا نہیں کہ بیماری میں علاج نہ کرے یا اسباب معیشت کو بوجہ اختلاف اختیار نہ کرے پھر دین ہی کو ایسا سستا کیوں سمجھ لیا گیا ہے کہ ذرا سا بہانہ ملا اور اس کو چھوڑا دیا۔ عدالت میں مقدمات دائر ہوتے ہیں ایک فریق دعوے کا اثبات کرتا ہے دوسرا نفی مگر فیصلہ کی صورت کسی عاقل نے یہ تجویز نہیں کی کہ اذا تعارضا ..... تساقطا کہہ کر کسی فریق کو بھی ڈگری نہ دی جائے اگر ایسا ہوتا تو عدالت ہی کا قائم کرنا فضول تھا۔ غرض اختلاف سے کوئی چیز خالی نہیں لیکن اختلاف

کے وقت اور اختلاف کے وقت ان تمام احادیث پر عمل کرنا صحیح طریقہ نہیں بلکہ حتی الامکان اختلاف کو رفع کرنا چاہیئے اور اگر کسی طرح رفع نہ ہو سکے تو احوط پر عمل کرنا چاہیئے یعنی وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیئے جس میں احتیاط کا پہلو ہو۔ یہی علماء نے حدیث کے بارہ میں کیا ہے کہ اول تو اختلاف کو رفع کیا ہے اور تطبیق دی ہے یا قوی کو ضعیف پر ترجیح دی ہے اور جب کوئی صورت تطبیق اور ترجیح کی نہ ہو سکی تو احوط پر عمل کیا یہی معنے ہیں اس قول کے کہ محرم کو مبیح پر ترجیح ہے[1]۔ علماء اسلام کا یہ طریقہ کس قدر عقل سلیم کے موافق ہے۔ غرض اختلاف کی وجہ سے اگر حدیث کو چھوڑا جائے تو فن تاریخ کو اور علاج معالجہ کو بلکہ تمام اسباب معیشت کو بھی چھوڑ دینا چاہیئے اور اگر ان کو نہیں چھوڑا جاتا ہے تو حدیث کو کیوں چھوڑا جائے جب کہ آخرت کے تمام نتائج اسی پر موقوف ہیں۔ حدیث کے متعلق تمام شبہات کا حل کر دیا گیا اس کا نتیجہ حضرت مصنف بیان فرماتے ہیں کہ اگر حدیث کی سندوں اور الفاظ اور راویوں کے حالات کو نظر غور سے دیکھا جائے تو دل کو پورا یقین ہو جاتا ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال بلا شک و شبہ محفوظ ہو گئے ہیں اور یہی غرض ہے رسالت سے تاکہ حضور کے اقوال و افعال کی تقلید کی جائے۔ بیان اس کا یہ ہے کہ کسی خبر پر یقین کرنے کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے ایک یہ کہ ہم تک وہ خبر کیسے پہنچی جن لوگوں نے ہم تک پہنچائی ان کا سلسلہ برابر ملتا چلا آیا ہے یا درمیان میں منقطع ہو گیا ہے

---

[1] یعنی جس حدیث سے کسی چیز کی حرمت ثابت ہوتی ہو اس کو اس پر ترجیح ہے جس سے جواز ثابت ہو ۱۲

اس سلسلہ کو سند کہتے ہیں۔ (اسانید سند کی جمع ہے) دوسرے یہ کہ اصل خبر
جو ہم کو سند سے پہنچی ہے عقل سلیم کے نزدیک ایسی ہے کہ جسکی طرف نسبت کی جاتی ہے اسکی طرف قابل
نسبت کرنے کے ہے یا نہیں۔ اس اصل خبر کو متن کہتے ہیں (متون جمع متن کی
ہے) تیسرے یہ کہ سند کے اشخاص کیسے ہیں قابل اعتبار ہیں یا نہیں۔
ان اشخاص کو رجال کہتے ہیں (جس فن میں ان کے حالات سے بحث
کی جاتی ہے اس کو فن اسماء الرجال کہتے ہیں) حدیث میں جب یہ تینوں
باتیں تلاش کی جاتی ہیں تو ایسی صحیح صورت میں ملتی ہیں کہ دوسری کسی تاریخ کی
کتاب میں نہیں مل سکتیں اس کو ہم بہت شرح وبسط کے ساتھ بیان کر آئے ہیں
اس واسطے اعادہ نہیں کرتے اور صرف ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں جس سے
حضرت مصنف مدظلہٗ کی تحریر کی توضیح ہو جائے گی وہ یہ ہے کہ فرض کیا جائے
کہ ہم کو یہ خبر ملی کہ فلاں تاریخ میں پارلیمنٹ نے لندن سے ایک قانون جاری
کیا ہے تو دیکھا جائے گا کہ جس ذریعہ سے یہ خبر آئی ہے وہ ذریعہ پارلیمنٹ
تک متصل ہے یا نہیں مثلاً ایک اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی اور اس نے دوسرے
اخبار سے نقل کیا اور اس نے تیسرے سے اور اس نے سرکاری گزٹ سے
نقل کیا جو پارلیمنٹ سے شائع ہوتا ہے تو اس کی سند صحیح ہے اور یہ خبر ضرور قابل اعتبار ہوگی اور یہ
بھی دیکھا جائیگا کہ جو مضمون پارلیمنٹ کی طرف منسوب کرکے نقل کیا گیا ہے وہ اس قابل ہے کہ پارلیمنٹ
کی طرف منسوب کیا جا سکے یا نہیں مثلاً اس کے الفاظ و معانی ایسے ہیں جیسے

قانونِ شاہی کے ہوتے ہیں تو عقل اس کو تسلیم کرے گی کہ پارلیمنٹ کا
شائع کردہ ہے۔ اور اگر ایسے نہیں ہیں مثلاً ہزلیات ہیں یا گالیاں
اور بیہودہ باتیں ہیں تو صاف ثابت ہو جائے گا کہ ان کی نسبت پارلیمنٹ
کی طرف غلط ہے اور کسی پاگل یا مسخرے کی اختراع ہے۔ یا اپریل فول کی قسم
سے ہے اور یہ بھی دیکھا جائے گا کہ جن اخباروں نے ایک نے دوسرے
سے نقل کیا ہے وہ سب قابلِ اعتبار ہیں یا نہیں اگر ہیں تو اس خبر کو صحیح سمجھا
جائے گا جب یہ سب باتیں جمع ہو جائیں گی تو کچھ شبہ نہ رہے گا کہ وہ مضمون
پارلیمنٹ کا شائع کردہ ہے۔ جب ہم اس معیار سے احادیث کو جانچتے ہیں
تو تمام دنیا کی خبروں اور تاریخوں سے صحیح تر اور زیادہ قابلِ اعتبار ثابت
ہوتی ہیں۔ جس زمانہ میں احادیث جمع کی گئیں اس زمانہ سے زمانۂ رسالت
تک سندیں متصل موجود ہیں اور حضرات روایت کنندگان کی ایک ایک کی
سوانحعمری ہمارے سامنے ہے ان کے حالات ایسے پاکیزہ ہیں کہ فی زمانہ کسی
ایک کی نظیر بھی ملنا مشکل ہے۔ اور ہر متن حدیث بول اٹھتا ہے کہ ضرور یہ زبان
رسالت ہے حتیٰ کہ بعض ماہرین فن حدیث صرف الفاظ حدیث کو سن کر پہچان
لیتے تھے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور یہ موضوع ہے پھر جب تنقید کی جاتی
تو ان کا خیال صحیح ثابت ہوتا تھا غرض محقق اور منصف مزاج کے لئے اس
بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ علم حدیث کے ذریعہ سے

حضورؐ کے اقوال و افعال بلا تغیر و تبدل محفوظ ہو گئے ہیں حتٰی کہ بعض متعصب عیسائیوں کا یہ قول ہے کہ کوئی امت اپنے نبی کے اقوال و افعال کو ایسا نہیں بیان کر سکتی جیسا مسلمان اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اقوال و افعال کو بیان کر سکتے ہیں تم بتا سکتے ہیں کہ حضورؐ کا حلیہ ایسا تھا قد ایسا تھا یوں اٹھتے تھے یوں بیٹھتے تھے یوں چلتے تھے یوں کھاتے تھے یوں پیتے تھے یوں بات کرتے تھے۔ واقعی وہ سچ کہتا ہے کسی مذہب میں علم حدیث رسول موجود نہیں اور اہل اسلام کے پاس ایسا موجود ہے کہ سبحان اللہ اور صل علٰی۔ کتاب الدعوات کو پڑھئے تو وہ الفاظ بجنسہٖ موجود ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے سوار ہوتے اوپر چڑھتے نیچے اترتے وقت طلوع آفتاب کے وقت غروب کے وقت پڑھتے تھے غرض ہر ہر کام کے وقت کی دعائیں منقول و محفوظ ہیں ان دعاؤں کے الفاظ بول اٹھتے ہیں کہ یہ الفاظ زبان معجز بیان ہی کے الفاظ ہیں اس کا ثبوت یہ ہے کہ بڑے بڑے فصحاء و شعراء کی تصنیف کردہ کسی دعا کو پڑھئے اور ایک حدیث کی دعا کو پڑھئے ایک عامی آدمی بھی سن کر بول اٹھے گا کہ دونوں میں کچھ نسبت نہیں دونوں ایسے علیحدہ معلوم ہوتے ہیں جیسے تیل اور پانی کہ دونوں کو کیسا ہی ملا دو مگر ذرا دیر میں تیل الگ اور پانی الگ ہو جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ حضورؐ کے اقوال ضرور خلط ملط سے محفوظ ہیں جب اقوال محفوظ ہیں تو افعال بھی محفوظ ہیں کیونکہ جو راوی اقوال کے ہیں وہی افعال کے بھی ہیں۔ حدیث میں کچھ تو بات

یہ تقریر تو خبر آحاد میں بھی جاری ہوتی ہے اور اگر کتب حدیث کو
جمع کر کے ان کے متون اور اسانید کو دیکھا جاوے تو اکثر متون میں
اتحاد و اشتراک اور اسانید میں تعدد و تکثر نظر آئے گا۔ جس سے وہ احادیث

یکساں ہونا ۱۲ جمع سند ۱۲ متعدد ہونا ۱۲ بہت ہونا ۱۲

ہے کہ غیر قوموں کے فضلا اس کی طرف جھکتے جاتے ہیں جیسا کہ ہم اس
بحث کے شروع میں لکھ آئے ہیں کہ فضلاء مستشرقین مثلاً گولڈ زیہر اور
ڈاکٹر اسپرانگر پرنسپل مدرسہ کلکتہ وغیرہ ہم حدیثوں کے جمع کرنے کی طرف اس قدر
مائل ہو رہے ہیں کہ سب کاموں سے زیادہ اس کو ضروری سمجھتے ہیں۔ افسوس
ہے کہ مسلمان جن کے گھر کا یہ خزانہ ہے وہ اس کو دور پھینکنا
چاہتے ہیں۔

حدیث کے معتبر اور قابل حجت ہونے کے لئے یہ تقریر اب تک شرح
و بسط کے ساتھ کی گئی ہے اس سے خوبی ثابت ہوتا ہے کہ وہ حدیث بھی قابل
حجت ہے جس کو خبر آحاد کہتے ہیں اس کو بھی نظر انداز کر دینا جائز نہیں اور
حدیث متواتر کی شان تو کہیں اعلیٰ اور ارفع ہے۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ
خبر آحاد اور متواتر کی شان پہلے بیان کر دیں تاکہ یہ مضمون سمجھ میں آسکے حدیث
متواتر وہ حدیث ہے جس کے روایت کرنے والے ہر زمانہ میں اس قدر کثیر
ہوں کہ ان سب کے جھوٹ پر اتفاق کر لینے کو عقل سلیم محال سمجھے۔ اور خبر آحاد
وہ حدیث ہے جس کے راوی اس قدر کثیر نہ ہوں خواہ ہر زمانہ میں ایک ایک

متواتر ہو جاتی ہیں اور متواتر میں شبہات متعلقہ بالرواۃ کی گنجائش
جمع راوی ۱۲
ہی نہیں رہتی کیونکہ متواتر میں راوی کا صدق یا ضبط یا عدل کچھ
سچا ہونا ۱۲ حافظہ قوی ہونا ۱۲ معتبر ہونا ۱۲
بھی شرط نہیں۔

راوی رہا ہو یا دو دو چار چار مگر متواتر سے کم ہوں علمائے دونوں کے مرتبہ میں فرق کیا ہے جیسا کہ عقل سلیم بھی یہی کہتی ہے اور علمائے دونوں کے شرائط قبول میں بھی فرق کیا ہے۔ خبر آحاد کے قبول کیلئے وہ شرائط ہیں جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ اسکی سند متصل ہو درمیان میں کہیں منقطع نہ ہوئی ہو اور سب راوی ثقہ اور بالکل قابل اعتبار ہوں جب یہ شرائط خبر آحاد میں پائے جائیں تو وہ بھی قابل قبول اور واجب العمل ہو جاتی ہے (یہ روایت بھی ایسی ہوگی کہ تاریخ کی کوئی صحیح سے صحیح اور متواتر روایت بھی اس کے برابر نہیں ہو سکتی) اور حدیث متواتر کے لئے اتنی سخت شرطیں نہیں ہیں کیونکہ جب ہر طبقہ میں اس کے روایت کرنے والے اس قدر رہیں کہ ان کا اجتماع جھوٹ پر کسی طرح نہیں تسلیم کیا جا سکتا تو عقل سلیم ہی کہتی ہے کہ روایت صحیح ہے۔ دیکھئے ہم نے کلکتہ شہر نہیں دیکھا مگر یہ خبر دینے والے کہ کلکتہ ایک شہر ہے ہر جگہ اتنے اشخاص موجود ہیں کہ عقل کسی طرح اس کو نہیں تسلیم کر سکتی کہ یہ سب جھوٹ بولتے ہیں اس واسطے ہم کو یقین ہے کہ کلکتہ ضرور ایک شہر ہے اگرچہ اس کی خبر دینے والوں میں جھوٹے اور بد چلن اور بد دیانت سب ہی طرح کے لوگ ہیں سمجھ میں آگیا ہوگا کہ خبر متواتر کے لئے خبر آحاد جیسی شرطیں نہ لگانا عین ہمارے

اب بعد اثبات حجیت حدیث کے درایت سے اس کی تنقید کرنے کا غلط

ثابت ہونا بھی معلوم ہو گیا ہو گا کیونکہ حدیث صحیح کا ادنیٰ درجہ وہ ہے جو ظنی از لحاظ لغت

عرف کے موافق ہے۔ اب سنیئے کہ ہم اگر ایسی حدیثوں پر نظر ڈالتے ہیں جن کو کسی محدث نے خبر آحاد میں شمار کیا ہے تو وہ بھی ہم کو صرف ایک کتاب میں نہیں بلکہ متعدد کتابوں میں ملتی ہیں اس طرح کے یا تو متون (اصلی الفاظ) حدیث سب میں بالکل یکساں ہوتے ہیں یا الفاظ میں قدرے فرق ہوتا ہے لیکن معنے اور مفہوم ایک ہی ہوتا ہے اور ان میں اختلاف اس سے زیادہ نہیں ہوتا جیسے کلکتہ کی خبر دینے والوں میں ہے کہ پچاس اشخاص سے پوچھو تو سب ایک لفظ سے نہیں کہیں گے۔ کوئی کہے گا کلکتہ شہر ہے کوئی کہے گا بڑا شہر ہے کوئی کہے گا ضلع ہے کوئی کہے گا پایۂ تخت ہے کوئی کہے گا دارالسلطنت ہے کوئی کہے گا تجارت گاہ ہے کوئی کہے گا جہازوں کا بندرگاہ ہے کوئی کہے گا بنگال کا صدر مقام ہے وغیرہ وغیرہ یہ خبر مختلف الالفاظ ہے مگر متفق المعنے ہے کیونکہ سب سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ کلکتہ شہر کا وجود ہے اور ہر کتاب میں اس خبر آحاد کی سند بھی دوسری ملتی ہے تو اس کی سندیں متعدد ہو گئیں تو وہ حدیث جو ایک کتاب کے لحاظ سے خبر آحاد میں شمار ہو سکتی تھی متعدد کتابوں میں ملنے سے خبر واحد ہونے سے نکل جاتی ہے اور متواتر کہی جا سکتی ہے تو اب اس کے لئے شرائط بھی نرم ہو جائیں گی پس اگر اس کے راویوں میں وہ سخت شرائط بھی نہ پائی جائیں جو

خبر واحد ہونے کی حالت میں ضروری ہیں۔ تب بھی مضر نہیں جیسے کلکتہ کی خبر دینے والوں کے متعلق ہم ابھی کہہ چکے ہیں کہ باوجود اختلاف الفاظ کے بوجہ تواتر کے خبر کی صحت یقیناً ثابت ہوتی ہے اور اس کے ماننے کے لئے روایت کنندگان کے حالات کی تفتیش و تحقیق کہیں کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ غرض علم حدیث ایسا مدون و محفوظ علم ہے جس کے ذریعہ سے اکثر اخبار آحاد بھی بوجہ کثرت اسناد اور تعدد طرق کے درجہ میں قریب خبر متواتر کے ہو جاتی ہیں تو اس کا جھٹلانا یا اس میں شک کرنا ایسا ہی ہے جیسے کلکتہ کی خبر کو جھٹلانا یا کلکتہ کے وجود میں شک کرنا۔ جب خبر آحاد کا یہ درجہ ہے تو اس حدیث کا درجہ معلوم ہوا جو متواتر ہے۔ حاصل یہ کہ ہر ایک حدیث واجب التسلیم ہے۔

اب حضرت مصنف مدظلہ ایک اور غلطی کو بیان فرماتے ہیں جس میں منکرین حدیث مبتلا ہیں وہ یہ ہے کہ جب ان کو کسی حدیث کے متعلق سند وغیرہ میں جرح کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی اور اس کا مضمون اپنی رائے کے خلاف ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس وجہ سے ساقط عن الاعتبار ہے کہ اس کا مضمون درایت کے خلاف ہے جیسے حدیث

مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ — جو شخص کسی قوم کے ساتھ مشابہت اختیار کرے وہ انہی میں سے ہے۔

کے متعلق کہا ہے کہ یہ حدیث اگر بلحاظ روایت کے صحیح بھی مان لی جاوے تو بلحاظ درایت کے صحیح نہیں کیونکہ اسلام و ایمان تو دل میں ہوتا ہے ۔

اگر [illegible] کسی قوم سے مشابہت ہوگئی تو دل کیسے بگڑ گیا اور ایمان کیسے جاتا رہا حضرت مصنف مدظلہٗ نے اس کی تردید کیسی باقاعدہ اور مدلل اور عاقلانہ اور حکیمانہ اور منصفانہ کی ہے جس کی تقریر یہ ہے کہ حدیث کا مضمون کم سے کم ایسا ضرور ہوگا جس کو ظنی الدلالت اور ظنی الثبوت کہا جا سکے ۔ اور جس سے مقابلہ ہے یعنی درایت اس کی حقیقت دلیل عقلی ظنی ہے ۔ اور اصول موضوعہ نمبر ۷ میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ ایسی صورت میں دلیل نقلی ہی کو ترجیح ہوتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ حدیث کو چھوڑ کر درایت پر عمل کیا جائے ۔ یہ مضمون اصول موضوعہ نمبر ۷ میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان ہو چکا ہے ۔ وہاں ملاحظہ فرمانا چاہیے لیکن ہم کو ناظرین سے امید نہیں کہ وہاں ملاحظہ فرمانے کی تکلیف گوارا کریں گے لہذا ہم نہایت اختصار کے ساتھ اس مضمون کو یہیں لکھے دیتے ہیں ۔ وہ یہ ہے کہ دلیل نقلی اور دلیل عقلی میں تعارض ہونے کی چار ہی صورتیں ہو سکتی ہیں ۔ صورت اول یہ کہ دلیل عقلی بھی قطعی اور یقینی ہو اور دلیل نقلی بھی قطعی ہو یعنی ثبوت کے لحاظ سے بھی قطعی ہو اور دلالت کے لحاظ سے بھی قطعی ہو یعنی اس کے الفاظ میں کسی دوسرے معنے کا احتمال نہ ہو ۔ اس کی فرضی مثال یہ ہے کہ دلیل عقلی یہ کہتی ہے کہ ایک اور دو برابر نہیں ہو سکتے اس

کے مقابلہ میں اگر کوئی دلیل نقلی یہ کہے کہ ایک اور دو برابر ہو سکتے ہیں - اس کا حکم یہ ہے کہ دلیل عقلی کو ترجیح ہوگی - لیکن بہت تحدّی اور دعوے کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ شریعت اسلامی میں کہیں ایسا نہیں ہے کہ اس کا ایسی دلیل عقلی سے تعارض ہو یہ اسلامی خصوصیات میں سے ہے اور اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اسلام عقل کے مطابق ہے - دوسری صورت یہ ہے کہ دلیل نقلی بھی ظنی ہو یعنی یقینی نہ ہو اور دلیل نقلی بھی ظنی ہو یعنی اس میں کسی دوسرے خلاف ظاہر معنے کا احتمال بھی ہو - حکم اس کا یہ ہے کہ دلیل نقلی کو ترجیح دی جائے گی کیونکہ اس وقت دلیل عقلی کسی بات میں نقلی سے بڑھی ہوئی نہیں ہے تو دلیل نقلی میں توجیہ و تاویل کی کیا ضرورت ہے اور دلیل عقلی کا ظنی ہونا خود بتا رہا ہے کہ جانب مخالف کا احتمال بھی ہے پھر دلیل نقلی کی وجہ سے عقلی کو اس محتمل جانب کی طرف پھیرنے میں کیا حرج ہے (اس کو اصول موضوعہ نمبر ۷ میں بہت شرح و بسط کے ساتھ مع نظائر کے بیان کیا گیا ہے وہاں دیکھ لیا جائے) - تیسری صورت یہ ہے کہ دلیل عقلی قطعی ہو اور نقلی ظنی اس کا حکم یہ ہے کہ دلیل عقلی کو ترجیح دی جائے گی اور نقلی کو بوجہ ظنی ہونے کے اس معنے پر محمول کیا جائیگا جس کا اس میں خود احتمال موجود ہے جس کی وجہ سے اس کو ظنی کہا گیا جیسا کہ ظاہر ہے چوتھی صورت یہ ہے کہ دلیل نقلی قطعی ہو یعنی ایسی صاف ہو کہ دوسرے کسی معنے کا اس میں احتمال نہ ہو اور دلیل عقلی ظنی ہو اس کا حکم ظاہر ہے کہ دلیل نقلی کو اختیار کیا جائیگا اور عقلی کو بوجہ محتمل ہونے کے چھوڑ

دیا جائے گا اور یہ بہت موٹی بات ہے۔ اب سمجھیئے کہ جب کسی حدیث کو
درایت کے خلاف کہا جاتا ہے تو اس کے معنے یہی ہیں کہ درایت اور
حدیث میں تعارض ہے۔ بلفظ دیگر دلیل عقلی اور نقلی میں تعارض ہے تو ضرورت
کہ دیکھا جائے یہ تعارض ان اقسام چہارگانہ میں سے کس قسم میں داخل ہے۔ درایت
کو دلیل عقلی کہا جاتا ہے مگر اس سے زیادہ نہیں کہ دلیل عقلی ظنی کہا جا سکتا ہے
کیونکہ دلیل عقلی قطعی وہ ہے جس سے کسی امر محال کا استلزام ہوتا ہو اور جو
ایسی نہ ہو وہ سب ظنی ہی میں داخل ہیں۔ آج کل جس کو درایت کہا جاتا ہے
اس کا کوئی فرد بھی ایسا نہیں جس میں کسی محال کا استلزام ہو (یہ اور بات
ہے کہ محال اور ممکن ہی کو کوئی نہ سمجھتا ہو ایسا شخص علمی گفتگو کرنے کے قابل نہیں۔
چاہیئے کہ اول علمی اصطلاحات کو معلوم کرے پھر گفتگو کرے) جب درایت کسی
محال کو مستلزم نہیں تو دلیل قطعی نہ ہوئی بلکہ ظنی رہی بلکہ آج کل کی درایت کے
بہت سے افراد تو وہمی اور خیالی[1] ہی میں داخل ہیں اور بمقابلہ اس کے دلیل
نقلی (حدیث) بہت سی تو قطعی ہیں ورنہ کم از کم (بوجہ خبر آحاد ہونے کے یا
دلالت قطعی نہ ہونے کے) ظنی تو ضرور ہیں تو تعارض کہیں دلیل نقلی قطعی اور عقلی
ظنی کا ہوا اور کہیں نقلی ظنی اور عقلی ظنی کا ہوا

---

[1] جیسے آج کل بعض فیشن ایبل کہہ دیتے ہیں کہ داڑھی منڈانا شریعت میں منع ہے تو کیا ہے۔ لیکن داڑھی رکھنا سوسائٹی میں باعث خفت و ذلت ہے اور خواہ مخواہ ذلت اختیار کرنا فطرت کے خلاف ہے یہ درایت محض خیالی ہے ۱۲ -

و ظنی الثبوت ہو اور جس چیز کا درایت نام رکھا ہے اس کا حاصل دلیل عقلی ظنی ہے اور اصول موضوعہ نمبر ۷ میں تقدیم نقلی ظنی کی عقلی ظنی پر ثابت ہو چکی ہے -

---

تو جب کہ حدیث قطعی ہو تو اس کا مقابلہ تو درایت سے کچھ معنے ہی نہیں رکھتا اور جب حدیث ظنی ہو تب بھی حسب اصول مسلمہ مذکورہ ترجیح حدیث ہی کو ہو گی پھر اس کے کیا معنے ہیں کہ درایت سے حدیث صحیح کی تنقید کی جاتی ہے اس کی حقیقت یہی تو ہے کہ دلیل نقلی قطعی یا ظنی کو دلیل عقلی ظنی کی وجہ سے چھوڑا جاتا ہے جو سراسر غلط ہے - فاعتبروا یا اولی الابصار

اہلِ تشکیک کی طرف سے حدیث کے قابلِ حجت نہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ حدیث واجب العمل اسی بنا پر کہی جا سکتی ہے کہ وہ فرمان رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے - اور فرمان نام ہے ایک مفہوم کا اور مفہوم مخاطب تک بذریعہ الفاظ کے پہنچتا ہے تو اگر الفاظ محفوظ نہ رہے تو مفہوم بھی محفوظ نہ رہا اور الفاظ حدیث مختلف روایتوں میں مختلف ملتے ہیں اس کو روایت بالمعنے کہتے ہیں تو مفہوم میں بھی اختلاف ہو گیا تو کسی مفہوم کے متعلق بہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ فرمان رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے پھر وہ قابلِ حجت کیسے ہوا اس کا جواب چند طریق پر ہے اول یہ کہ سلف کو بلا ضرورت روایت بالمعنے کی عادت نہ تھی کیونکہ روایت

رہا قصہ روایت بالمعنے کا سو اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اول تو بلا
ضرورت اس کی عادت نہ تھی اور ان کے حافظے کو دیکھتے ہوئے
ضرورت نادر ہوتی تھی - پھر ایک ایک مضمون کو اکثر مختلف صحابہ نے
سن سن کر روایت کیا ہے چنانچہ کتب حدیث کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے
سو اگر ایک نے روایت بالمعنے کیا تو دوسرے نے روایت باللفظ کر دیا

بالمعنے وہ کرے جس کو الفاظ یاد نہ ہوں اور الفاظ یاد نہ رہنے کی وجہ
دو ہو سکتی ہیں حافظہ کی کمزوری یا لاپرائی - حافظہ کی حالت ہم پہلے لکھ
آئے ہیں صحابہ کے حافظہ کے متعلق تو کیا کہا جائے جن ائمہ حدیث نے
تدوین حدیث کی ہے مثلاً امام بخاری کی حالت یہ تھی کہ ان کے سامنے سو
حدیثیں گڑبڑ کر کے پڑھی گئیں اور انہوں نے علی الترتیب سب کو صحیح کر دیا
اور امام ترمذی کے استاد نے چالیس حدیثیں دہرائیں اور کسی میں فرق
نہ نکلا وغیرہ وغیرہ جن کا دہرانا تطویل لاطائل ہے اور لاپرواہی کی وجہ دو
ہو سکتی ہیں عظمت نہ ہونا یا محبت نہ ہونا اور جس کے دل میں کسی کی عظمت
یا محبت ہوتی ہے اس کی بات کبھی بھول نہیں سکتا سلف کے دل میں جو عظمت
اور محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی اس کے قائل صرف ہم
اہل اسلام ہی نہیں بلکہ اعدائے اسلام بھی قائل ہیں - غزوۂ حدیبیہ میں کفار
جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر میں آئے تو دیکھا کہ صحابہ کی حالت

ہے کہ حضورؐ تھوکتے ہیں یا ناک سنکتے ہیں تو فضلۂ مبارک زمین پر نہیں گرنے پاتا اس کو بدن پر مل لیتے ہیں وضوء مبارک کا پانی زمین پر نہیں گرتا اوپر ہی اوپر بطور تبرک بدن پر مل لیا جاتا ہے اس کا اثر یہ ہوا کہ کفار مرعوب ہو گئے اور تمام قوم سے جا کر یہ کہا کہ ان سے جیتنا بڑا مشکل ہے ان کا ہر ہر متنفس حضورؐ کے پسینہ کے قطرہ پر اپنا خون بہا دے گا۔ نہ معلوم ہمارے بھائی یعنی اہل تشکیک عقل و انصاف کہاں رکھ آئے ہیں جو ایسی قوم کی نسبت گمان رکھتے ہیں کہ انہوں نے الفاظ فرمودہ زبان رسالتؐ بدل دیئے ہیں۔ صحابہ کی محبت کے سامنے مجنوں اور لیلےٰ اور فرہاد و شیریں کی محبت نقل اور عکس کی بھی نسبت نہیں رکھتی۔ صحابہ ان الفاظ کو بھی جن کو حضورؐ نے کبھی بطور ناخوشی و زجر ارشاد فرمایا تھا مزے لے لے کر روایت کیا کرتے تھے چنانچہ حضرت ابو ذر صحابی سے حضورؐ نے ایک نئی سی بات ارشاد فرمائی اس پر انہوں نے تعجب کیا اور دوبارہ پوچھا پھر حضورؐ نے وہی فرمایا پھر سہ بارہ پوچھا پھر وہی فرمایا اور ساتھ ہی یہ لفظ بھی فرمایا۔

عَلٰی رَغْمِ اَنْفِ اَبِیْ ذَرٍّ — یعنی ایسا ہی ہو گا چاہے ابو ذر کی ناک مٹی میں رگڑ جائے۔

ابو ذر جب اس واقعہ کو روایت کرتے تو یہ لفظ عَلٰی رَغْمِ اَنْفِ اَبِیْ ذَرٍّ روایت کرتے۔ بعض صحابہ کوئی حدیث روایت کرتے رقت ہوتے:۔

كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَيْهِ — یعنی یہ واقعہ مجھے ایسا یاد ہے کہ گویا میں اس وقت دیکھ رہا ہوں ۔

اور کبھی کہتے :۔

سَمِعَتْهُ أُذُنَايَ وَوَعَاهُ قَلْبِي — یعنی اس بات کو میرے دونوں کانوں نے سنا اور میرے دل نے یاد کر لیا

غرض سلف جیسے عشاق رسول سے یہ بات نہایت بعید ہے کہ محبوب کے الفاظ کی طرف سے لاپرواہی کریں یا بھول جائیں خصوصاً جب کہ کذب علی الرسول کے متعلق سخت سخت وعیدیں بھی سن چکے ہیں جیسے :۔

مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً — جو کوئی میرے اوپر قصداً جھوٹ بولے

فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔ — تو وہ اپنا ٹھکانا دوزخ کو سمجھے

اور روایت باللفظ کے متعلق خوشنودی محبوب کے الفاظ اور بشارتیں سن چکے ہوں جیسے :۔

نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْداً سَمِعَ — خوش وخرم رکھے اللہ اس بندہ کو جس نے میری

مَقَالَتِي فَحَفِظَهَا وَوَعَاهَا — بات سنی پس اس کو یاد کر لیا اور خوب محفوظ

وَأَدَّاهَا كَمَا سَمِعَهَا۔ — کر لیا اور دوسروں تک اس کو ویسا ہی پہنچا دیا جیسا سنا تھا

بنا بریں دعوے کیا جاتا ہے کہ سلف کی عادت روایت بالمعنی کی نہ تھی گو یہ نہ کہا جائے کہ روایت بالمعنی احادیث میں کہیں موجود نہیں ۔ روایت

بالمعنے جس قدر موجود ہے وہ شاذ و نادر یا اقل کے حکم میں ہے اور اکثر روایت باللفظ ہے پھر ہم تعجب کرتے ہیں کہ قلیل بلکہ اقل کے حکم کو ہمارے بھائیوں نے کل پر کیسے جاری کر دیا حالانکہ قاعدہ مسلمہ تو للاکثر حکم الکل ہے دیکھئے دنیا میں کوئی بھی قاعدہ کلیہ نہیں جتنے کام دنیا کے چل رہے ہیں سب بنا بر للاکثر حکم الکل چل رہے ہیں کھانا کھاتے ہیں اکثر یہ ہے کہ ہضم ہو جاتا ہے اور کبھی ہضم نہیں بھی ہوتا اور بدہضمی ہو جاتی ہے ریل میں یا جہاز میں سفر کرتے ہیں اکثر بخیریت پہنچ جاتے ہیں اور کبھی ہلاک بھی ہو جاتے ہیں ۔ کونین بخار کے لئے دی جاتی ہے اکثر مفید ہوتی ہے اور کبھی نہیں بھی ہوتی ان سب چیزوں کو نظر باکثریت ہی استعمال کرتے ہیں ۔ سنکھیا اگر کھایا جائے تو اکثر یہ ہے کہ ہلاک کرتا ہے اور کبھی ہلاک نہیں بھی کرتا لیکن نظر باکثریت اس سے ہر شخص اجتناب کرتا اور ڈرتا ہے غرض للاکثر حکم الکل دنیا بھر کا قاعدہ مسلمہ ہے خدا جانے حدیث کے بارہ میں اس کو چھوڑ کر للاقل حکم الکل کیوں مان لیا گیا اور تھوڑی روایات بالمعنے کو دیکھ کر کل روایات کو مشتبہ کیوں کر دیا گیا ۔ پھر یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ ایک ایک مضمون کو مختلف راویوں نے روایت کیا ہے ۔ اگر کسی کی روایت بالمعنے ہے تو دوسرے کی روایت باللفظ بھی ہے ۔ چند روایتوں کے ملانے سے پتہ چل جاتا ہے کہ اصل مضمون کیا ہے دیکھئے عدالت میں چند

گواہ ایک واقعہ کی تصدیق میں گواہی دیتے ہیں اور الفاظ مختلف ہوتے ہیں تو مجسٹریٹ کو اصل واقعہ کا علم ہوجاتا ہے حالانکہ یہ اشکال وہاں بھی ہو سکتا ہے کہ جب الفاظ میں اختلاف ہے تو مفہوم میں بھی اختلاف ہے تو واقعہ کیسے ثابت ہوا عدالتوں میں اگر اس وہم کو دخل دیا جائے تو ایک فیصلہ بھی نہیں ہو سکتا بلکہ عدالتوں میں تو اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ گواہوں کی متفق اللفظ شہادت پیش کیا جاتا ہے کہ یہ سب بناتے ہوتے اور سکھائے ہوئے گواہ ہیں ورنہ اگر واقعہ کو دیکھا ہوتا تو اپنے اپنے مختلف الفاظ سے بیان کرتے یہ مثال بطور الزامی جواب کے ہے ورنہ متفق الالفاظ ہونا بھی واقع میں مضر نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ احادیث میں جہاں کہیں اختلاف الفاظ ہے (جس کو روایت بالمعنی کہا جاتا ہے) وہ اسی قسم کا اختلاف ہے جو سچے گواہوں میں ہوتا ہے کہ ہر شخص واقعہ کو اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے اور جب اشخاص متعدد ہیں تو تعبیریں بھی متعدد ہو جاتی ہیں اور یہ اختلاف ان کے عدم تصنع اور سچے ہونے کی دلیل ہوتی ہے نہ کہ مشتبہ ہونے کی اور ہم اہلِ تشکیک سے پوچھتے ہیں کہ ایسے احتمالات تاریخ میں کیوں نہیں نکال لیتے جس میں نہ اسناد ہیں نہ رجال کا پتہ اور روایت باللفظ کا تو اس میں نام ہی نہیں الا نادراً۔

حدیث میں جہاں روایت بالمعنے ہے مختلف روایتوں کو ملانے سے یہ

معلوم ہو جاتا ہے کہ اصل مضمون کیا ہے اور وہ روایتیں اکثر متقارب المعنے ہوتی ہیں جس سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ جنہوں نے روایت بالمعنے کی ہے انہوں نے بھی اصل مضمون کے سمجھنے میں غلطی نہیں کی اور بات یہی ہے کہ جس کو احادیث کی وعیدوں سے خوف ہوگا وہ الفاظ کو بھی نہ بدلے گا اور معنے کے سمجھنے میں بھی اپنی امکانی کوشش سے کام لے گا کیونکہ حضورؐ کے ارشادات سے مقصود صرف نقل الفاظ ہی نہیں ہے یہ تو جب ہوتا کہ مخاطب اس ارشاد کی تعمیل کا مکلف نہ ہوتا اور صرف بطور پیغام دوسروں ہی کو پہنچانے کا مکلف ہوتا حالانکہ واقع میں اس کے خلاف ہے جس سے کوئی ارشاد حضورؐ نے فرمایا مخاطب اول اس کی تعمیل کا وہی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی حکم ہے کہ اس کو دوسروں تک بھی پہنچاؤ تو جس کے قلب میں امر شرعی کی وقعت اور اللہ و رسول کی عظمت و محبت ہے وہ الفاظ سے زیادہ معنے کو سمجھنے کی کوشش کرے گا تاکہ اس حکم کی تعمیل کرے اور سر مو فرق عمل میں نہ رہے۔

اور اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ کسی حدیث کے الفاظ بالکل ہی محفوظ نہیں رہے اور صحابی نے صرف اپنے الفاظ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود ادا کیا ہے سو اول تو یہ شبہ بہت ہی ضعیف ہے کیونکہ ایسا بہت ہی کم واقع ہوا ہے دلیل اس کی ان کے حافظوں کی قوت اور احتیاط ہے تاہم

اور پھر دونوں کے معانی متوافق (یکساں ۱۲) ہونے سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ
جنہوں نے روایت بالمعنے بھی کیا ہے انہوں نے اکثر صحیح ہی سمجھا ہے
اور واقعی جس کو خشیت (خوف ۱۲) و احتیاط ہوگی وہ معنے فہمی میں بھی خوف سے کام
لے گا بدون شرح صدر (مطمئن) نہ ہوگا۔ اور اگر کہیں الفاظ بالکل ہی محفوظ
نہ رہے ہوں گو ایسا نادر ہے مگر پھر بھی ظاہر ہے کہ متکلم کا مقرب مزاج

علی سبیل التسلیم کہا جاتا ہے کہ صحابہ حضورؐ کے درباری اور مقرب مزاج
شناس عشاق تھے وہ حضورؐ کی بات کے سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتے تھے اور
روایت بالمعنے میں بھی انہوں نے ایسی صحیح ترجمانی کی ہے کہ دوسرا کوئی ایسی
ترجمانی نہیں کر سکتا کیونکہ کسی کے کلام کے لب و لہجہ اور طرز گفتگو کو (ان
کو قرائن مقالیہ کہتے ہیں) نیز مقام گفتگو اور مخاطبین کی حالت کو بھی دخل ہوتا ہے (ان کو قرائن
مقامیہ کہتے ہیں) اور یہ ہر دو قسم کے قرائن صحابہ ہی کی نظر میں تھے ان کے بعد کسی کو حاصل نہ ہوئے
تو جیسا کہ حدیث کو ان قرائن کے ساتھ صحابہ سمجھ سکتے تھے بعد کے لوگ نہیں سمجھ سکتے تو اگر کسی صحابی نے حضورؐ
ارشاد کی روایت بالمعنے بھی کی اور فرض یہ کیا گیا ہے کہ حضورؐ کے الفاظ بالکل
ہی بدل گئے ہیں تب بھی یہ یقین کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ جو معنے انہوں نے
سمجھ کر دوسرے الفاظ سے ادا کئے وہی صحیح ہیں کیونکہ قرآن ان کے سامنے
نازل ہوا حدیثیں انہوں نے اپنے کانوں سے سنیں قرائن مقالیہ اور مقامیہ سب
ان کی نظر میں تھے۔ بعد کے لوگوں کا خصوصاً صدیوں کے بعد کیا منہ ہے کہ

شناس جس قدر اس کے کلام کو قرائن مقالیہ اور مقامیہ سے صحیح سمجھ سکتا ہے دوسرا ہرگز نہیں سمجھ سکتا۔ اس بنا پر صحابہ کا فہم قرآن و حدیث میں جس قدر قابلِ وثوق ہوگا دوسروں کا نہیں ہوسکتا پس دوسروں کا ان کے خلاف قرآن سے یا محض اپنی عقل سے کچھ سمجھنا اور اس کو روایت مخالف حدیث ٹھہرا کر حدیث کو رد کرنا کیونکر قابلِ التفات ہو سکتا ہے۔ اور ان تمام امور

ان کے مقابلہ میں قرآن و حدیث کے سمجھنے کا دعوے کریں اور یہ کہیں کہ صحابی کی وہ روایت قرآن کے یا عقل کے .... خلاف ہے اور اس وجہ سے درایۃً قابلِ تسلیم نہیں۔ یہ بہت موٹی بات ہے۔

غرض حدیث کے حجت ہونے کے متعلق کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہی اخیر میں یہ کہا جاتا ہے کہ اگر اب بھی کوئی شبہ پیدا کیا جائے تو اس کا نتیجہ زائد سے زائد یہ ہو سکتا ہے کہ بعض حدیثیں یعنی جن میں شبہ پیدا کیا گیا ہو درجۂ قطعیت کو نہ پہنچ سکیں گی لیکن درجۂ ظنیت میں تو ضرور رہیں گی جس کا اثر یہ ہے کہ احکام قطعیہ ان سے نہ ثابت ہوں گے اور احکام ظنیہ اب بھی ثابت ہوں گے تاہم یہ صحیح ہوگا کہ وہ احادیث بھی حجت ہیں کیونکہ ایک قسم کے احکام دین ان سے ثابت ہوتے ہیں نہ یہ کہ وہ بالکل قابلِ حجت نہیں اور ہمارے بھائیوں نے تو حد ہی کر دی کہ ایسی حدیثوں کے ساتھ تمام احادیث کو حتیٰ کہ قطعی حدیثوں کو بھی نعوذ باللہ رد کر دیا۔

لحاظ کرتے ہوئے پھر اگر کسی شبہ کی گنجائش ہو سکتی ہے تو وہ شبہ غایت
ما فی الباب بعض حدیث کی قطعیت میں مؤثر ہو سکتا ہے سو بہت سے بہت
یہ ہوگا کہ ایسی احادیث سے احکام قطعیہ ثابت نہ ہوں گے لیکن احکام
ظنیہ بھی چونکہ جزو دین اور واجب العمل ہیں لہٰذا وہ ظنیت
بھی مضر مقصود نہ ہوگی۔

اس بیان میں قطعی اور ظنی کے الفاظ آئے ہیں ہم ان کی شرح کئی دفعہ کر
چکے ہیں مگر یہاں بھی مناسب سمجھتے ہیں کہ مختصراً ان کے معانی بیان کر
دیں تاکہ ناظرین غلطی سے بچیں ظنی ظن کی طرف منسوب ہے یعنی وہ چیز جس
میں ظن پایا جائے مگر ظن کے معنے آج کل کے عرف میں گمان خیال وہم ہیں اگر
اس معنے کر حدیث کو ظنی کہا جائے تو یہ معنے ہوں گے کہ وہ خیالی بات ہے
اور جو حکم اس سے ثابت ہو وہ بھی خیالی بات ہوگی علماء کی مراد حدیث کے
ظنی ہونے نیز اس سے ثابت شدہ حکم کے ظنی ہونے سے یہ عرفی
معنے ہرگز نہیں کیونکہ شریعت خیالی اور وہمی باتوں سے مبرا
ہے بلکہ لفظ ظن مقابل قطع کا ہے قطع کے معنے ہیں یقین جس میں جانب
مخالف کا احتمال ہی نہ ہو تو جب حدیث کو قطعی کہا جائے تو معنے یہ
ہوں گے کہ یہ حدیث ایسی ہے کہ اس میں کسی قسم کا احتمال اور شک و
شبہ باقی نہیں جیسے حدیث متواتر۔ اور جس حدیث کو ظنی کہا جائے اس کے

معنے یہ ہوں گے کہ یہ حدیث اس درجہ کی نہیں جس درجہ کی قطعی حدیث تھی
جیسے خبر آحاد نہ یہ کہ محض خیالی بات ہے ۔ اور دونوں قسم کی حدیثوں سے
جو احکام ثابت ہوں گے ان میں بھی یہی نسبت ہوگی کہ حدیث قطعی سے حکم
قطعی ثابت ہوگا اور حدیث ظنی سے حکم ظنی یعنی قطعی سے کم درجہ کا ہوگا مثلاً قطعی
کا منکر کافر ہے اور ظنی کا منکر کافر نہیں عقائد قطعیہ میں چونکہ دلیل قطعی کی ضرورت
ہے اس واسطے حدیث ظنی کام نہ دے گی باقی احکام دونوں قسم کے ہوتے
ہیں قطعی بھی اور ظنی بھی لہٰذا احکام مذکورہ میں حدیث ظنی کام دے گی علمائے
اسلام نے ہر چیز کو نہایت صحیح درجہ میں رکھا ہے نماز کا پانچ وقت فرض
ہونا حدیث قطعی سے ثابت ہے لہٰذا اس کے منکر پر کفر کا فتویٰ ہے اور
قراءۃ فاتحہ خلف الامام حدیث قطعی سے ثابت نہیں لہٰذا علماء میں سے جو
لوگ اس کو ضروری بھی کہتے ہیں وہ بھی اس کے منکر پر کوئی فتویٰ نہیں لگاتے
غرض حدیث ظنی بھی حجت ہے اور اس سے جو حکم ثابت ہو وہ بھی واجب العمل
ہے صرف خیالی باتیں نہیں ۔

ناظرین ہماری کتاب میں یہاں حدیث کا بیان ختم ہوتا ہے اب ہم
منکرین حدیث کی خدمت میں ایک ضروری گزارش کر کے دوسرا مضمون
یعنی اجماع کی بحث شروع کریں گے وہ ضروری گزارش یہ ہے کہ یہ فطری
اور تمام دنیا کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ نعمت کا شکر واجب ہے اس کے

خلاف کرنے والے کو "ناشکرہ" "ناحق شناس" "نمک حرام" "کافر نعمت" وغیرہ بُرے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے اور نعمت جس قدر عظیم ہو شکر بھی اسی قدر کثیر ہونا چاہئے شکر کے معنے وہ ہیں دل سے احسان ماننا اور وہ نعمت جس غرض سے دی گئی ہو اسی غرض کو اس سے حاصل کرنا۔ مثلاً ایک شخص بھوک سے مر رہا ہے اور اس کو اُس وقت کوئی کھانا دے تو اُس کے ذمہ ضروری ہے کہ اس کا شکریہ ادا کرے اور کھانے کو کھائے اگر ان دونوں میں سے ایک بات کی اور ایک نہ کی تو شکر ادا نہ ہوگا مثلاً زبان سے شکریہ ادا نہ کیا بلکہ ناک بھوں چڑھائی یا دینے والے کو بُرا بھلا کہا اور کھانا کھا لیا تو کہا جائے گا بڑا نمک حرام اور خود مطلب ہے یا زبان سے شکریہ ادا کیا اور کھانا نہ کھایا تو کہا جائے گا کہ بڑا جاہل ہے کھانے کو ایسے وقت میں بھی نہ کھایا جب کہ بھوک سے دم نکل رہا ہے اور دینے والے کے زحم کی خاک قدر نہ کی۔ اہلِ اسلام کے لئے حق تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت وجود باجود سرورِ عالم حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ شکر کے معنے حضور کی بعثت سے خوش ہونا اور زبان وجنان[1] سے اقرار کرنا ہوں گے اور حضور سے اس چیز کو حاصل کرنا جس کے لئے حضور مبعوث ہوئے ان سب باتوں کا پتہ ہم کو اس آیت سے ملتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَے — بے شک احسان کیا اللہ تعالےٰ نے

---

[1] دل ۱۲

الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ	مومنین پر کہ ان میں ایک رسول ان
رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا	ہی میں سے بھیجا جو ان پر آیات الٰہی
عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ	پڑھتا ہے اور ان کا تزکیہ نفس کرتا ہے اور
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا	ان کو کتاب اور حکمت سکھلاتا ہے
مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝	حالانکہ اس کی بعثت سے پہلے وہ کھلی ہوئی

(آل عمران ۱۶۴؟)

آیت ہذا سے حضور کا نعمت ہونا اور بعثت سے غرض تلاوت آیات قرآنی
اور تزکیہ اور تعلیم معانی کتاب و حکمت ثابت ہوئی شکر اس کا یہ ہوگا کہ زبان و جنان سے
اظہار رضا کیا جائے اور اغراض بعثت کو حاصل کیا جائے بعثت کی غرض صرف
تلاوت الفاظ آیات نہیں ہے بلکہ تزکیہ اور تفہیم معانی آیات اور تعلیم حکمت
بھی جس کو ہم مشرح طور پر شروع بحث حدیث میں لکھ آئے ہیں یہاں یہ کہنا ہے
کہ تزکیہ اور تفہیم معانی اور تعلیم حکمت حضور نے اپنے ارشادات سے فرمائی ان
ہی کو احادیث کہتے ہیں اگر احادیث حجت نہیں ہیں تو حضور کی بعثت کی کوئی ضرورت
نہیں تھی یہ کافی تھا کہ قرآن لکھا لکھایا اتار دیا جاتا جیسے توریت شریف لکھی لکھائی نازل ہوئی تھی [1]

---

[1] نسبت نزول توراۃ میں الفاظ قرآنی میں غور کیا جائے تو حدیث کا حجت ہونا صاف ثابت ہوتا ہے کیونکہ
فرمایا ہے وکتبنا له فی الالواح من کل شیء موعظة وتفصیلا لکل شیء۔ یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے
لئے تختیں لکھی ہوئی دیں جن میں ہر قسم کی نصیحت اور احکام تھے آگے فرماتے ہیں:۔ فخذها بقوة وامر
قومك یاخذوا باحسنها ۔ یعنی ان کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور اپنی قوم کو حکم دو کہ اس کے اچھے سے
اچھے حکم پر عمل کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ امر موسیٰ علیہ السلام نے اپنے الفاظ میں کیا ہوگا۔ اسی کو حدیث رسول
کہتے ہیں تو اس کا ماننا حق تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہوئی۔

جب بعثت کی ضرورت نہیں تو بعثت نعمت بھی نہ ہوئی یہ قرآن کے ساتھ معاندانہ[لہ]
ہے۔ ثابت ہوا کہ حضورؐ کا نعمت ہونا اس پر موقوف ہے کہ احادیث کو بھی حجت
مانا جائے تو احادیث کو نہ ماننا ناشکری اور کفران نعمت ہوا اور نعمت جس قدر
عظیم ہوتی ہے اس کا کفران بھی اتنا ہی گناہ عظیم اور خسران ہوتا ہے تو احادیث کا نہ ماننا
بڑا گناہ ہوا جس کی برابر کوئی گناہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ احادیث
صرف صحابہ کے لئے حجت تھیں بعد کے لوگوں کے لئے حجت نہ رہیں اس کا جواب یہ
ہے کہ آیت مذکورہ بعینہ دوسری جگہ سورۂ جمعہ میں بھی ہے اور اس میں لفظ
وَّآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ بھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بعثت حضورؐ
کی اور فیوض اربعہ مذکورہ (تلاوت آیات و تزکیہ و تعلیم کتاب و حکمت) صرف قرن حاضر
کے لئے نہیں ہیں بلکہ آئندہ نسلوں کے لئے بھی ہیں تو جس طرح کہ فیوض اربعہ قرن
اول کو پہنچے اسی طرح قرون آئندہ کو بھی پہنچنے چاہئیں اور اگر قرون مابعد کو
بلا احادیث کے پہنچ سکتے ہیں تو قرون اول کو بطریق اولیٰ پہنچ سکتے تھے۔ غرض
احادیث کو نہ ماننا بعثت کو نعمت نہ سمجھنا ہے جو بدترین ناشکری اور کفرانِ
نعمت اور اعظم الخطایا ہے: فاعتبروا یا اولی الابصار بحث حدیث ختم
ہوئی۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

لہ مقابلہ و مخالفت ١٢ -

انتباہ ششم

متعلق اجماع منجملہ اصول شرع

اب رہ گیا اجماع اور قیاس سو اجماع کے متعلق یہ غلطی کی جاتی ہے کہ اس کا
رتبہ رائے سے زیادہ نہیں سمجھا جاتا اس لئے اس کو حجت ملزمہ نہیں قرار دیا
دلیل احکام کو واجب التعمیل ثابت کرنے والی ۱۲
جاتا۔ سو یہ مسئلہ اول تو منقول ہے اس میں نقل پر مدار ہے۔ سو ہم نے
نقلی دلیل سے ثابت ہے ۱۲
جو نقل کی طرف رجوع کیا تو اس میں یہ قانون پایا کہ جس امر پر ایک زمانہ کے

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اصول شرع یعنی وہ چیزیں جن سے دین کے احکام ثابت ہوتے ہیں چار ہیں قرآن اور حدیث اور اجماع اور قیاس متبعین ہوائے نفسانی نے ان چاروں اصول کے متعلق غلطیاں کی ہیں۔ قرآن و حدیث کے متعلق جو غلطیاں کی جا رہی ہیں ان کا بیان ہو چکا۔ اب انتباہ ششم میں ان غلطیوں کا بیان ہے جو اجماع کے متعلق کی جاتی ہیں۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ

اول اجماع کی حقیقت بیان کر دیں تاکہ اس کے متعلق ہر بات کے سمجھنے میں سہولت ہو۔ اجماع کے معنے لغت میں ہیں "اتفاق رائے" اور علماء شریعت کی اصطلاح میں "امت محمدیہ کے مجتہدین صالحین کا ایک زمانہ میں کسی دین کی بات پر اتفاق رائے کر لینا" وہ بات از جنس عقائد ہو یا از جنس اعمال اور وہ اتفاق قولی ہو مثلاً سب نے زبان سے کہا کہ ہم اس سے متفق ہیں یا فعلی مثلاً سب نے بلا انکار ایک کام شروع کر دیا یہ بھی اجماع میں داخل ہے حکم اس کا یہ ہے کہ جس طرح قرآن و حدیث حجت ہیں اسی طرح اجماع بھی حجت ہے یعنی جس طرح قرآن و حدیث سے احکام دین ثابت ہوتے ہیں اسی طرح اجماع سے بھی ثابت ہوتے ہیں اجماع کے حجت ہونے کا ثبوت آیات قرآنی اور احادیث سے ہے مثلاً ایک آیت یہ ہے۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ	جو کوئی مخالفت کرے گا رسول (صلی اللہ
بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى	علیہ وسلم) کی اس کے بعد کہ اس پر راہ
وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ	ہدایت واضح ہو چکی ہو (یعنی وہ حکم صریح)
الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى	اور اتباع کرے گا راہ مومنین کے سوا دوسری
وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاۗءَتْ	راہ کی تو ہم اس کو جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے
مَصِيْرًا۔	اور داخل کریں گے ہم اس کو جہنم میں
	اور جہنم بری جگہ ہے۔

ظاہر ہے کہ "سبیل مومنین" وہی ہے جس کو مومنین اختیار کریں اسی کا ترجمہ اجماع ہے - اور اس آیت کی رو سے مخالفت رسول اور مخالفت اجماع ایک ہی حکم میں ہیں تو جیسا کہ حکم رسول واجب التسلیم اور حجت ہے ایسے ہی اجماع بھی واجب التسلیم اور حجت ہوگا - اور ایک حدیث یہ ہے:-

لا تجتمع امتی علی الضلالۃ — میری امت گمراہی پر اجماع نہیں کر سکتی۔

ثابت ہوا کہ اجماعی حکم ہمیشہ صحیح اور سراسر ہدایت ہی ہوگا۔ یہ حدیث متواتر المعنے ہے[1] یعنی اس مضمون کی حدیثیں اس کثرت سے موجود ہیں کہ سب مل کر تواتر کی حد تک پہنچا دیتی ہیں گو الفاظ سب کے ایک نہیں ہیں۔ اجماع کے متعلق دیگر آیات احادیث اور مبسوط بحثیں کتب اصول میں موجود ہیں غرض قرآن و حدیث سے اجماع کا حجت ہونا ثابت ہے اسی واسطے حضرت مصنف مدظلہ فرماتے ہیں کہ یہ مسئلہ منقول ہے یعنی دلیل نقلی سے ثابت ہے تو جو شخص قرآن و حدیث کا قائل ہے اس کو اجماع کا قائل ہونا بھی ضروری ہے اور اجماع کا قائل نہ ہونا قرآن و حدیث کا قائل نہ ہونا ہے - اور یہ مسئلہ تو ایسا ہے کہ اگر اس کے لئے دلیل نقلی نہ بھی ہوتی تو دلیل عقلی فطری موجود ہے جو ہم کو اس کے ماننے پر مجبور کرتی ہے وہ دلیل یہ ہے کہ ہم اپنے کاموں میں دن رات دیکھتے ہیں کہ کثرت رائے پر عمل کیا جاتا ہے - کثرت کے مقابلہ میں قلت کو چھوڑ دیا جاتا ہے حتی کہ سو میں سے انچاس (۴۹) رائے ایک طرف ہوں

---

[1] کذا فی نور الانوار ۲۱۲

علمارِ امت کا اتفاق ہوجائے اس کا اتباع واجب ہے اور اس کے ہوتے ہوئے اپنی رائے پر عمل کرنا ضلالت ہے خواہ وہ امر اعتقادی ہو خواہ عملی ہو چنانچہ وہ نقل اور اس سے استدلال کتب اصول میں مصرح مذکور ہے سو جس طرح کوئی کتاب قانون کی حجت ہو تو اس کے کل دفعات واجب العمل ہوتے ہیں اسی طرح جب قرآن و حدیث حجت ہیں تو اس کے بھی کل قوانین واجب العمل ہوں گے۔ سو ان قوانین میں سے ایک قانون یہ بھی ہے کہ اجماع حجت قطعیہ ہے سو اس قانون پر بھی عمل واجب ہوگا اور اس کی مخالفت واقع

اور اکیاون (۵۱) ایک طرف تو اکیاون والی رائے کو اختیار کیا جاتا ہے اور انچاس (۴۹) والی کو چھوڑ دیا جاتا ہے صرف اس وجہ سے کہ ایک طرف ایک رائے بڑھی ہوئی ہے اور اگر کسی بات پر سو کے سو (۱۰۰) کو اتفاق ہو اور ایک رائے بھی خلاف نہ ہو تب تو وہ بات بالکل صحیح اور پختہ سمجھی جاتی ہے اسی کا ترجمہ اجماع ہے۔ تو جیسا کہ ہم دنیا کے کاموں میں اجماع پر پورا اطمینان کرتے ہیں اسی طرح دین کے کاموں میں اجماع پر کیوں نہ اطمینان کریں اسی کا ترجمہ حجت ہونا ہے۔ غرض دلیل نقلی اور عقلی سب سے اجماع کا حجت ہونا ثابت ہے اور یہ کہنا کہ اجماع بھی رائے ہے اور رائے رائے سب برابر ہیں اگر اب کسی کی رائے اس کے خلاف ہے تو اس کو سلف کے اجماع کا ماننا ضروری نہیں محض بے وقوفی اور نقل و عقل کے خلاف ہے اور یہ ایسی موٹی بات ہے جس کے لئے تطویل کلام

ہیں اس قانون الٰہی و نبوی کی مخالفت ہو گی اور یہ امر بہت ہی ظاہر ہے
اور اگر یہ مسئلہ منقول بھی نہ ہوتا تاہم قانون فطری عقلی بھی ہم کو اس پر مضطر کرتا
ہے کہ جب ہم اپنے معاملات میں کثرت رائے کو منفرد رائے پر ترجیح دیتے
ہیں اور کثرت رائے کے مقابلہ میں منفرد رائے کو کالعدم سمجھتے ہیں تو اجماع
تو کثرت رائے سے بھی بڑھ کر یعنی اتفاق آراء ہے وہ منفرد رائے کے مرتبہ
میں یا اس سے مرجوح کیسے ہو گا۔ اور اگر یہ شبہ ہو کہ بے شک منفرد رائے اجماع

کی ضرورت نہیں۔ ہاں ایک شبہ یہ ہو سکتا ہے کہ جیسے سلف نے کسی رائے
پر اجماع کیا ہم بھی کر سکتے ہیں تو چاہیے کہ ان کا اجماع حجت ہو سکتا ہے ایسے ہی
ہمارا اجماع بھی حجت ہونا چاہیے سلف نے ایک ضرورت زمانہ کو ملحوظ رکھ کر
اجماع کیا تھا زمانہ کے بدلنے سے ضرورتیں بھی بدل گئیں اب اگر ہم موجودہ
ضرورتوں کے لحاظ سے ان کے خلاف کسی بات پر اجماع کریں تو وہ کیوں
حجت نہ ہو گا اور ہمارے اجماع سے ان کا اجماع کیوں نہ منسوخ سمجھا جائے گا کیونکہ قرآن و حدیث سے جہاں
اجماع کا حجت ہونا ثابت ہے وہاں کسی زمانہ کی خصوصیت مذکور نہیں جیسا کہ اوپر گزرا تو ہر زمانہ کے
مسلمانوں کا اجماع حجت ہو سکتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بدیہی بات ہے کہ کثرت رائے یا
اتفاق آراء میں ہر شخص کی رائے معتبر نہیں ہوتی بلکہ جس فن اور جس کام کے متعلق
وہ رائے ہوتی ہے اس کے ماہرین کی رائے معتبر ہوتی ہے اور ان ہی
سے رائے لی جاتی ہے دیکھا ہو گا کہ علاج کے متعلق جب بورڈ ہوتا ہے

کے روبرو قابل وقعت نہ ہوگی لیکن اگر ہم بھی اس اجماع کے خلاف پر اتفاق رائے کرلیں تب تو اس میں معارضہ کی صلاحیت ہوسکتی ہے جواب یہ ہے کہ ہر شخص کا اتفاق رائے ہر امر میں معتبر نہیں بلکہ ہر فن میں اس کے ماہرین کا اتفاق معتبر ہوسکتا ہے سو اگر ہم اپنا دینی حالت کا حضرات سلف سے

تو اس میں بڑے بڑے ڈاکٹر ہی جمع کئے جاتے ہیں اور ان ہی سے رائے لی جاتی ہے اور ان ہی کی کثرت رائے یا اتفاق آراء پر عمل کیا جاتا ہے ۔ اور تعمیر کے متعلق جب کمیٹی ہوتی ہے تو بڑے بڑے انجینئر لوگ جمع کئے جاتے ہیں نہ کہ معمولی راج مزدور وغیرہ اور راز دشما اس کی بنا اسی اصل پر تو ہے کہ ہر فن میں ہر کس وناکس کا بلکہ اہل فن کا بھی اعتبار نہیں کیا جاتا صرف ماہرین فن کا اعتبار کیا جاتا ہے اس اصل پر نظر آتے ہوئے اگر ہم انصاف کے ساتھ غور کریں تو ہرگز یہ نہ کہہ سکیں گے کہ آج کل کے لوگوں کا اجماع بمقابلہ اجماع سلف کے کوئی چیز ہے اور اجماع سلف کے لئے ناسخ ہوسکتا ہے وجہ یہ ہے کہ آج کل کے لوگوں کو سلف کے ساتھ وہی نسبت ہے جو عوام کو خواص کے ساتھ یا غیر ماہر کو ماہر کے ساتھ ہوتی ہے خواہ از روئے علم سمجھا جاتے خواہ از روئے عمل ۔ از روئے علم تو ظاہر ہے کہ بعد کے لوگ ان ہی کے علوم کے خوشہ چیں ہیں بعض علوم ان پر ختم ہو چکے جیسے علم حدیث کہ محدثین سلف پر ختم ہوگیا اور جیسے اجتہاد کہ یہ بھی ختم ہوگیا اب حدیث و فقہ جو کچھ ہے وہ سب

انصاف کے ساتھ مقابلہ کریں تو اپنی حالت میں علماً و عملاً بہت ہی انحطاط پائیں گے جس سے ان کے ساتھ ہم کو ایسی ہی نسبت ہوگی جو غیر ماہر کو ماہر کے ساتھ ہوتی ہے۔

ان ہی کی یادگار ہے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ   یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

اور ازروئے عمل بھی حالت یہی ہے ان کی سی خوف و خشیت ان کی سی ہمت ان کا سا زہد ان کا سا ورع و تقوےٰ ان کا سا انہماک فی الدین اور خلوص یہ افسانے ہیں کہ کتابوں میں ہیں اور بالکل اس کے مصداق ہیں کہ مسلمانان در گور و مسلمانی در کتاب۔ ان کا یہاں ذکر کرنا غیر ضروری ہے۔ ان کی نسبت غیر اقوام متعصبین کے یہ الفاظ ہیں کہ سچے متوکل سچے خدا پرست خالص مذہبی لوگ اگر تھے تو یہی تھے۔ اور احقر کہتا ہے کہ کسی فن میں کمال صرف علم سے نہیں ہوتا بلکہ عمل سے ہوتا ہے اور علمی حقائق کا انکشاف عمل کے بڑھنے سے بڑھتا ہے بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو کتاب سے نہیں حاصل ہوتیں بلکہ تجربہ سے حاصل ہوتی ہیں اور بلا عمل کے علمی حقائق کا انکشاف نہیں ہوتا صرف نقل الفاظ ہوتی ہے۔ دیکھئے ایک ڈاکٹر کتنا ہی بڑا عالم ہو حتیٰ کہ ڈاکٹری کی کتابوں کا حافظ ہو جائے لیکن عمل اس کا ناقص ہو یعنی پریکٹس پوری نہیں ہوئی ہے تو وہ جب کام کرنے کھڑا ہوگا تو ایسا نہ کر سکے گا جیسے وہ شخص

پس اُن کے خلاف ہمارا اتفاق ایسا ہی ہوگا جیسے ماہرین کے اتفاق کے خلاف غیر ماہرین کا اتفاق، کہ محض بے اثر ہوتا ہے - البتہ جس امر میں سلف سے کچھ منقول نہ ہو اس میں اس وقت کے علماء کا اتفاق بھی قابلِ اعتبار ہوگا -

---

کر سکتا ہے جس کی پریکٹس پوری ہے چاہے وہ اس سے علم میں کم ہو وجہ یہی ہے کہ عمل سے ہی انکشاف حقائق ہوتا ہے - بناء بریں کہا جا سکتا ہے کہ اگر بالفرض آج کل کے لوگ سلف کے ساتھ کسی علم میں برابر بھی ہو جائیں تب بھی اس وجہ سے کہ عمل میں گھٹے ہوئے ہیں یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ علمی حقائق کا انکشاف ان کو سلف کی برابر نہیں ہو سکتا اور بہت سے دقائق علمی ایسے رہ جائیں گے جن تک ان کی رسائی نہیں ہوئی حاصل یہ ہوا کہ آج کل کے لوگ عمل میں تو گھٹے ہوتے ہیں ہی علم میں بھی سلف کے برابر نہیں ہو سکتے تو یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ آج کل کے لوگوں کو سلف کے ساتھ وہی نسبت ہے جو غیر ماہر کو ماہر کے ساتھ ہوتی ہے اور اجماع ماہرین ہی کا معتبر ہو سکتا ہے نہ کہ غیر ماہرین کا تو آج کل کا اجماع سلف کے اجماع کے لئے ناسخ کیسے ہو سکتا ہے -

ہاں اگر کوئی مسئلہ ایسا ہو کہ سلف سے اس میں کچھ منقول نہ ہو تو چونکہ اس صورت میں ماہرین اور غیر ماہرین کا مقابلہ نہیں اس وقت کے علما ہی

ماہر سمجھے جائیں گے اور ان کا اجماع بھی حجت ہو گا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ علماء سے مراد وہ علماء ہیں جو صرف رسمی عالم نہ ہوں بلکہ عالم اور فارغ التحصیل ہونے کے ساتھ صحبت یافتہ اور محقق اور نفوس قدسیہ رکھنے والے ہوں بندۂ ہوا و ہوس نہ ہوں زہد و تقوے و اخلاص پورا پورا حاصل کئے ہوئے ہوں۔ شہرت اور تعلّی اور نفسانیت سے دور بھاگتے ہوں۔ خلاصہ یہ کہ سچے نائب رسول ہوں ایک اور نئے علامت اس کی یہ ہے کہ ان میں بات کی پچ نہ ہو اگر کبھی بمقتضائے بشریت تسامح ہوا ہو تو او دلنے آدمی کے سمجھانے سے اور حق بات ذہن میں آجانے کے بعد اپنے قول سے رجوع کر لیں اور ترجیح الراجح اُن کا شعار ہو۔ ایسے علماء کا اجماع نئے مسئلہ میں یعنی جس میں سلف سے کچھ منقول نہ ہو اب بھی حجت قطعیہ ہو گا۔ لیکن راقم کا خیال یہ ہے کہ ایسا اجماع اس پُرفتن زمانہ میں جس میں علی العموم طبیعتوں میں کجی ہے محال نہ سہی کالمحال ضرور ہے۔ اس کا تجربہ ابھی قریب کے زمانہ میں کانگریس کے دَور دورہ کے وقت ہو چکا ہے کہ بہت سے علماء بھی کانگریس کے ہمنوا ہو گئے تھے اس وقت بہت لوگوں نے یہ کہا تھا کہ اس مسئلہ پر مسلمانوں کا اجماع ہو گیا ہے اور بمقتضائے حدیث ؎

لا تجتمع امتی علی الضلالۃ　　　میری امت گمراہی پر اجماع نہ کرے گی۔

یہی حق ہے حالانکہ نہ وہ اجماع تھا نہ اس طرف کثرت رائے تھی کیونکہ

اور اس میں ایک فطری راز ہے وہ یہ کہ عادۃ اللہ جاری ہے کہ غرض پرستی کے ساتھ تائید حق نہیں ہوتی اور خلوص میں تائید ہوتی ہے جب یہ امر ممہد ہو چکا تو سمجھنا چاہیئے کہ جس امر میں سلف کا اجماع موجود ہے جس کا حجت ہونا ثابت ہے اس کے . . . ہوتے ہوئے ہم کو اپنی اپنی رائے سے کام لینے کی دینی ضرورت نہیں تھی سو بلا ضرورت اپنی اپنی رائے پر عمل کرنا یا دون غرض پرستی کے نہ ہوگا اس لئے تائید حق ساتھ نہ ہوگی"

بکثرت علماء اس کے خلاف بھی تھے نہ جو لوگ اس میں شریک تھے وہ سب کے سب اہل علم تھے معمولی طلبہ بلکہ وکلاء بھی مولوی اور عالم بن گئے تھے اور جو علماء بھی شریک تھے بعض بھولے پن سے اور بعض طلب جاہ یا طلب مال یا دیگر ذاتی اغراض کی وجہ سے شریک تھے ایسا اجماع تو دجال کے وقت میں دجال کے صدق کے متعلق بھی ہوگا غرض اس زمانہ میں مسلمانوں کا اجماع جو اجماع کی شرائط کے ساتھ ہو قریب ناممکن کے ہے تاہم مسئلہ یہی ہے کہ اگر بالفرض اجماع صحیح پایا جائے تو حجت قطعیہ ہے۔

اور حضرت حکیم الامت مدظلہ نے اس بات کی کہ سلف کا اجماع موجود ہوتے ہوئے ہمارا اجماع مسترد ہے فلاسفی ارشاد فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ قانون فطرت (عادۃ اللہ) ہے کہ غرض پرستی کے ساتھ تائید الٰہی نہیں

اور جس میں اجماع نہیں ہے وہاں دینی ضرورت ہوگی اور دینی ضرورت
میں کام کرنا دلیل خلوص ہے اور خلوص میں تائید حق ساتھ ہوتی
ہے اس لئے وہ اتفاق بوجہ مؤید من اللہ ہونے کے قابل اعتبار ہوگا۔

ہوتی ۔ تائید الٰہی بھی ہوتی ہے کہ خلوص اور للٰہیت ہو جب کسی بات پر
سلف نے اجماع کر لیا تو ظاہر ہے کہ ان کا اجماع دین کے لئے اور
محض للٰہیت کے ساتھ تھا اب اس کے مقابلہ میں جو اس کے خلاف
اجماع ہوگا تو وہ بلا ضرورت ہوگا اور اس کی بنا سوائے نفسانیت اور
خود رائی کے کیا ہو سکتی ہے لہذا اس میں تائید غیبی نہ ہوگی اور وہ
مقبول عند اللہ نہ ہوگا پھر ایسا مردود اجماع مقبول اجماع کے مقابلہ میں
کیسے حجت ہو سکتا ہے ۔ رہا یہ کہ ضرورت کے بدلنے سے حکم بھی بدلنا چاہیئے
یہ وہی تقریر ہے جو آج کل آیات واحادیث کے مقابلہ میں بھی کی جاتی ہے چنانچہ
اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ نماز کا حکم انکسار اور فروتنی سکھانے کے لئے
تھا اور روزہ کی ایجاد قوت بہیمیہ وشہوانیہ کے توڑنے کے لئے ہوئی تھی
اب زمانہ تعلیم کا ہے تعلیم خود انسان کو مہذب بناتی ہے یہ دونوں
غرضیں صرف تعلیم ہی سے حاصل ہو جاتی ہیں پھر نماز کی اور روزہ کی ضرورت
کیا ہے ۔ علیٰ ہذا تمام دین میں اسی قسم کی تقریریں کی جاتی ہیں ۔ اس کا نام الحاد ہے
اور اس کا قائل ہونے والا خارج عن الاسلام ہے اس سے ہماری گفتگو

یہ سب اس صورت میں ہے جب سلف کا اجماع رائے سے ہوا ہو گو
وہ رائے بھی مستند الی النص ہوگی لیکن نص صریح موجود نہیں تھی اور اگر کسی نص کے
مدلول صریح پر اجماع ہوگیا ہے تو اس کی مخالفت نص صریح کی مخالفت ہے
اور اگر اس کے مخالف کوئی دوسری نص (یعنی دلیل شرعی ۱۲) صریح ہو تو آیا اس وقت بھی
اس اجماع موافق للنص کی مخالفت جائز ہے یا نہیں سو بات یہ ہے کہ تب

نہیں جو شخص اسلام کا نام لیتا ہے اس کو قرآن و حدیث کا ماننا ضروری ہے
اور ان میں اس قسم کی تاویلیں کرنا تحریف ہے اور تحریف درحقیقت تکذیب
اور انکار ہے پھر اسلام کا نام لگانا بیکار ہے اور جب کہ اجماع کا حجت ہونا آیات و
احادیث سے ثابت ہے تو اس کے بارہ میں یہ گفتگو کرنا کہ ضرورت کے
وقت اس کو بدل دینا چاہیئے بعینہٖ آیات و احادیث میں بھی گفتگو کرنا ہے
جو اسلام کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی الحاصل سلف کا اجماع کسی بات پر
موجود ہوتے ہوئے خلف کا اجماع معتبر نہیں اور یہ درجہ اس اجماع کا ہے
جو علماء صالحین سلف نے صرف اپنی رائے سے کیا ہو یعنی وہ مضمون کسی صریح
آیت یا حدیث کا نہ ہو اور اگر ایسا ہوا کہ وہ مضمون آیت یا حدیث میں بھی صراحۃً
موجود ہے اور اس پر سلف کا اجماع بھی ہوگیا تب تو خلف کا اجماع اس کے
خلاف بالکل ہی باطل ہے کیونکہ وہ اجماع سلف کے خلاف ہونے
کے ساتھ آیت صریح یا حدیث صریح کے بھی خلاف ہے اور اگر ایسی

بھی جائز نہیں کیوں کہ نص نص برابر اور ایک کو موافقت اجماع سے قوت
ہو گئی اور دلیل قوی کے ہوتے ہوئے ضعیف کا معمول بہ ہونا خلاف نقل اور
خلاف عقل ہے۔ بلکہ ہر گاہ دلیل نقلی سے امر مجمع علیہ کے ضلالت ہونے کا
امتناع ثابت ہو چکا اس لئے اگر اجماع کا مستند کوئی نص ظاہر بھی نہ ہو

عمل کی قابل ۱۲ — جس پر اجماع ہو ۱۲ — گمراہی ۱۲ — محال ہونا ۱۲ — سہارا ۱۲ — دلیل صریح ۱۲

صورت پیش آئے کہ ایک مسئلہ نص شرعی سے ثابت ہے اور اس پر سلف
کا اجماع بھی ثابت ہے لیکن بمقابلہ اس کے ہم کو کوئی نص شرعی صریح
اس کے خلاف بھی ملتی ہے تب کیا کیا جائے گا آیا اس نص پر عمل کیا جائے گا
جو اجماع کے خلاف ہے یا اجماع پر۔ اصولی مسئلہ یہ ہے کہ اس صورت میں
بھی اجماع ہی پر عمل کیا جائے گا کیوں کہ دونوں طرف نص موجود ہے تو اس
بات میں دونوں طرفیں برابر ہیں اور ایک طرف نص کے ساتھ اجماع بھی موجود ہے
تو اس نص کو قوت ہو گئی تو دلیل قوی کے ہوتے ہوئے ضعیف پر عمل کیسے جائز
ہو سکتا ہے۔ یہ بہت ظاہر بات ہے۔ اور اگر ایسی صورت پیش آئے کہ کسی
بات پر اجماع ہوا اور اس کی تائید میں کوئی نص نہیں ہے بلکہ اس کے
خلاف نص موجود ہے تب بھی اجماع ہی پر عمل کیا جائے گا وجہ یہ ہے کہ جب
دلائل قطعیہ حدیث و قرآن سے ثابت ہو چکا کہ جس بات پر اجماع ہو جائے
وہ باطل اور گمراہی کی بات نہیں ہو سکتی ادھر یہ بھی ظاہر ہے کہ نص کی مخالفت
بھی گمراہی ہے لیکن صورت مفروضہ میں اجماع ظاہراً نص کے خلاف پایا گیا

اور اس کے خلاف کوئی نص موجود ہو تب بھی اس اجماع کو یہ سمجھ کر منہدم رکھا جائے گا کہ اجماع کے وقت کوئی نص ظاہر ہوگی جو منقول نہیں ہوئی کیوں کہ نص کی مخالفت ضلالت ہے اور اجماع کا ضلالت ہونا محال ہے پس اس اجماع کا نص کے مخالف ہونا بھی محال ہے پس

دلیل صریح ۱۲

تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس اجماع کے ساتھ بھی ضرور کوئی نص ہو گی جس کے سہارے علماء مجتہدین سلف صالحین نے اجماع کیا کیونکہ سلف کی احتیاط اور ورع و تقویٰ اور خشیت ایسی نہ تھی کہ نص صریح کے خلاف سب کے سب اتفاق کر لیتے بس سوا اس کے کچھ نہیں ہے کہ کوئی نص ضرور موجود تھی جس پر انہوں نے اجماع بھی کر لیا اور وہ نص ہم تک نہیں پہنچی تو اب وہی صورت ہو گئی کہ دونوں طرف ایک ایک نص موجود ہے اور ایک کے ساتھ اجماع بھی ہے تو یہ نص قوی ہو گئی اور وہ ضعیف لہٰذا قوی کو اختیار کیا جائے گا۔ تو حقیقت اس کی یہ ٹھہری کہ ایک نص کے مقابلہ میں دوسری نص پر عمل ہوا بوجہ قوی ہونے کے اور اجماع سے ثبوت ہے اس دوسری نص کے موجود ہونے کا تو اس صورت میں اس مسئلہ کے لئے اجماع کو جو دلیل کہا جاتا ہے وہ دلیل کی ایک خاص قسم ہے جس کو دلیل اِنّی کہتے ہیں اور اس صورت میں یہ اجماع اور دوسری قسم کی دلیل نہیں ہے جس کو دلیل لِمّی کہتے ہیں بلکہ دلیل لِمّی نص ہی ہے۔ دلیل اِنّی اور لِمّی کی حقیقت یہ ہے کہ جس دلیل پر بناء ہو کسی حکم کی اس کو

لامحالہ نص کے موافق ہے اور جس نص کے بہ موافق ہے وہ دوسری نص پر بوجہ انضمام (مل جانا ۱۲) اجماع کے راجح (مقدم ۱۲) ہو گئی پس واقع میں نص پر مقدم نص ہی ہے اور اجماع اس نص کے وجود کی علامت و امارت ہے جس کو دلیل اِنّی کہتے ہیں - مثال اس کی جمع بین الصلوٰتین بلا سفر و بلا عذر ہے جس کی حدیث ترمذی میں ہے اور فجر احمر[ا] کے قبل[ا] اذن تسحر (سحری کھانا ۱۲) کا کہ وہ بھی ترمذی میں ہے؛

دلیل لمّی کہتے ہیں بنا ہونے کے معنے یہ ہیں کہ اگر وہ دلیل نہ ہو تو یہ حکم بھی نہ ہو۔ اور جس پر بنا نہ ہو بلکہ وہ صرف علامت ہو دوسری دلیل کی اس کو دلیل اِنّی کہتے ہیں تو یہاں اجماع پر بنا حکم کی نہیں ہے بلکہ اجماع سے پتہ چلا ہے کہ ضرور نص موجود تھی جو حکم کی بناء ہے اس کو تائید اجماع سے ہو گئی کیوں کہ اجماع ضلالت پر ہونا محال ہے تو اس صورت میں نص کے مقابلہ میں دوسری ایسی نص پر عمل ہوا جسکی قوت اجماع کی وجہ سے بڑھ گئی ہے - اس کی مثال یہ ہے کہ ایک حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر اور عصر میں اور مغرب

[ا] انتباہات کے اصل نسخہ میں وقت ہی کا لفظ ہے مگر حضرت مصنف مدظلہ نے فرمایا کہ وقت کی جگہ قبل کہہ دیا جائے کیوں کہ لفظ وقت سے ایہام ہوتا ہے کہ فجر احمر ہونے کے بعد بھی کھانا پینا جائز ہے حالانکہ قواعد عربیت سے الفاظ روایت کا ترجمہ یہ نہیں ہوتا اور فرمایا جس کے نسخہ میں لفظ وقت ہو وہ قبل بنالیں - ۱۲ منہ

اور عشاء میں جمع کیا مدینہ میں بلا کسی خوف یا بارش کے۔ لیکن اجماع امت کا اس کے خلاف ہے آج تک کسی اہلِ علم نے اس پر عمل نہیں کیا اجماع اس کے خلاف ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی نص صریح اہلِ اجماع کو اس کے خلاف ضرور ملی ہے کیوں کہ اجماع باطل پر ہونا محال ہے بروئے حدیث:

لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَۃِ — میری اُمت گمراہی پر اتفاق نہ کرے گی۔

دوسری مثال وہ حدیث ہے جس میں روزہ کے بارہ میں ہے:-

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَعْتَرِضَ لَكُمُ الْاَحْمَرُ — یعنی رات کو برابر کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ عرض آسمان میں فجر سرخ (شفق سرخ) نظر آنے لگے:

اس سے لازم آتا ہے کہ صبح صادق کے بعد بھی کھانا پینا جائز ہے جب تک کہ افق میں سرخی نہ پیدا ہو۔ اجماع اس کے خلاف ہے علماء اُمت میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں ہوا سب کے سب یہی کہتے ہیں کہ صبح صادق ہوتے ہی روزہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی وہی تقریر ہے کہ اجماع اس کے خلاف ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اہل اجماع کو ضرور کوئی نص صریح اس کے خلاف ملی کیونکہ اجماع باطل پر ہونا بروئے حدیث مذکور محال ہے:

انتباہ ہفتم

متعلق قیاس منجملہ اصول شرع

اب صرف قیاس رہ گیا اس میں متعدد غلطیاں کی جاتی ہیں - ایک غلطی قیاس کے معنے اور حقیقت میں ہے یعنی اس کی حقیقت (یعنی قیاس کی حقیقت ۱۲) واقعہ کا حاصل تو یہ ہے کہ جس امر کا حکم شرعی نص (قرآن و حدیث ۱۲) اور اجماع میں صریحاً بیان نہ کیا گیا ہو اور ظاہر ہے کہ کوئی امر شریعت میں مہمل نہیں ہے جس کے متعلق کوئی حکم

(چھوڑ دیا گیا ۱۲)

علم اصول میں ثابت ہو چکا ہے اور اوپر بیان بھی ہو چکا ہے کہ احکام شرعی چار قسم کی دلیلوں سے ثابت کئے جاتے ہیں قرآن اور حدیث اور اجماع اور قیاس سے پہلی تین قسم کی دلیلوں کا بیان ہو چکا - اب قیاس کا بیان ہے۔ قیاس کے متعلق بھی بہت غلطیاں کی جاتی ہیں - اول تو یہ کہ قیاس کی حقیقت ہی غلط سمجھ رکھی ہے پھر یہ کہ قیاس کے موقع و محل کو بھی نہیں

نہ ہو خواہ وہ امر معادی ہو یا معاشی جیسا کہ اشتباہ سوم کی غلطی چہارم
آخرتی ۱۲ دنیوی ۱۲
کے بیان میں مذکور ہوا ہے اس لئے یہ کہا جائے گا کہ حکم تو اس کا بھی شرع
میں وارد ہے مگر بوجہ خفاء دلالت خفی ہے پس ضرورت ہوگی اُس حکم خفی
تفریع کے سلسلہ بیان نہ ہونے کے ۱۲ پوشیدہ ۱۲

دیکھا جاتا اور نہ قیاس کی اہلیت و عدم اہلیت پر بھی نظر نہیں کی جاتی نہ
یہ دیکھا جاتا ہے کہ قیاس سے غرض کیا ہے۔ غرض اس مبحث کے متعلق
سر تا سر غلطی ہی غلطی رائج ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ لفظ قیاس اگرچہ عربی ہے
مگر اردو زبان میں بھی مستعمل ہے اور اس کو عوام و خواص سب بولتے ہیں لیکن
عربی اور ہندی معنے میں بہت فرق ہے پھر عربی میں بھی قیاس کے ایک
معنے لغوی ہیں اور ایک اصطلاحی۔ ہمارے تعلیم یافتہ بھائی جب سن لیتے
ہیں کہ شریعت میں قیاس بھی حجت ہے یعنی قیاس سے بھی احکام شرعی
ثابت ہو سکتے ہیں تو ان کو بہت گنجائش مل جاتی ہے اور ہر ہر حکم میں
قیاس سے کام لینے لگتے ہیں اور قیاس کے معنے وہی سمجھتے ہیں جو اپنے عرف میں ہیں حالانکہ
یہ خلط اصطلاح ہے۔ ہم اس بحث کو بہت مشرح لکھتے ہیں کیونکہ اس میں فی زمانہ
ابتلاء عام ہو رہا ہے۔ اس مشرح لکھنے میں حضرت مصنف مدظلہ کے کلام کی ترجمانی تو کافی ہو جائیگی
لیکن شاید ترتیب مطالب میں فرق ہو جائے اگر ایسا ہوا تو اس بحث
کے ختم پر حضرت مصنف کے بعض جملوں کی شرح بقدر ضرورت دوبارہ
کر دیں گے۔ جاننا چاہیئے کہ قیاس لفظ عربی ہے اس کے لغوی معنے

کے استخراج کی اس کا طریقہ ادلۂ شریعت نے یہ بتلایا ہے کہ جن
امور کا حکم نصاً مذکور ہے ان میں غور کر کے دیکھو کہ یہ امر مسکوت
عنہ ان میں سے خاص خاص صفات و کیفیات میں کس کے زیادہ مشابہ

اندازہ کرنا ہے مقیاس اسی سے اسم آلہ ہے۔ مقیاس اس چیز کو کہتے ہیں جس
سے کسی چیز کا اندازہ کیا جائے مثلاً مقیاس الحرارت تھرمامیٹر کو کہتے ہیں
کیوں کہ اس سے حرارت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ اور مقیاس الماء پانی کی
گہرائی ناپنے کا آلہ۔ مقیاس البرق بجلی کے ناپنے کا آلہ وغیرہ وغیرہ۔ قیاس
کے اصطلاحی معنے یعنی وہ معنے جو علماء اصول کے مقرر کردہ ہیں جو اس وقت
زیر بحث ہیں اس کو ہم بعد میں بیان کریں گے۔ پہلے وہ معنے بیان کرتے
ہیں جس میں ہمارے عرف میں مستعمل ہے۔ ہمارے عرف میں قیاس کے معنے
خیال، وہم، گمان، ہیں عوام جہلاء اکثر ان ہی معنوں میں استعمال کرتے ہیں مثلاً
کہا جاتا ہے کہ لارڈ صاحب تشریف لا رہے ہیں آنے کی غرض معلوم تو ہے
نہیں قیاسات دوڑائے جا رہے ہیں یعنی جو بات کسی کے وہم و گمان میں
آتی ہے کہتا ہے۔ اور جو لوگ تعلیم یافتہ اور سمجھدار سمجھے جاتے ہیں وہ
بھی اکثر اسی معنے میں استعمال کرتے ہیں اور کبھی دو چیزوں کو کسی بات میں
مشابہ دیکھ کر دونوں پر ایک حکم کر دینے کو قیاس کہتے ہیں جیسے ہائی کورٹ
سے ایک فیصلہ صادر ہوتا ہے وکلاء دوسری عدالتوں میں اسی جیسے

مماثل (مانند ۱۲) ہے پھر یہ دیکھو کہ اس امر منصوص (جس کا حکم صراحتہً موجود ہے ۱۲) الحکم میں اس کے حکم منصوص کی بنا بظن (گمان ۱۲) غالب کون سی صفت وکیفیت ہے ۔ پھر اس صفت وکیفیت کو اس امر مسکوت عنہ میں دیکھو کہ متحقق (موجود ۱۲) ہے یا نہیں۔

دوسرے مقدمات میں ہائی کورٹ کی وہ نظیر پیش کرتے ہیں اور اسی کے موافق فیصلہ ہو جاتا ہے یہ معنے اس معنے کے قریب ہیں جو علماء کی اصطلاح میں ہیں بلکہ بعینہ وہی ہیں صرف اتنا فرق ہے کہ علماء کی شرائط بوجہ اس کے کہ دین میں اس سے کام لیا جاتا ہے اور خوف خدا پیش نظر ہوتا ہے زیادہ سخت ہیں اور تعلیم یافتہ اصحاب چونکہ اپنی مطلب براری کے لئے استعمال کرتے ہیں اس واسطے اگر موقع پاتے ہیں تو کسی شرط کو حذف بھی کر دیتے ہیں عدالتوں میں ایسا موقع کم ملتا ہے لہذا کچھ احتیاط کرتے ہیں کیونکہ حکومت کا دباؤ اور خوف ہوتا ہے اور دین کے بارہ میں ایسے مطلق العنان ہیں کہ بلا قید موقع ومحل وشرائط کے استعمال کرتے ہیں جس سے قیاس قریب قریب اسی معنے کے آجاتا ہے جس میں عوام استعمال کرتے ہیں جیسے خیال وگمان ۔ اب وہ معنے سنیئے جو علماء شریعت کی اصطلاح میں ہیں وہ یہ ہیں کہ جس چیز کا حکم صراحتہً قرآن یا حدیث یا اجماع میں مذکور نہ ہو اس کا حکم ان ہی تینوں میں سے کسی سے نکالنا ۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ غور کیا جائے کہ وہ چیز جس کا حکم صراحتہً مذکور نہیں

اگر متحقق (موجود ۱۲) ہو تو اس امر کے لئے بھی وہی حکم ثابت کیا جائے گا
جو اس امر منصوص الحکم (صراحتہً موجود ۱۲) مماثل[1] میں منصوص ہے اور اس منصوص الحکم
کو مقیس علیہ اور اس امر مسکوت عنہ کو مقیس اور اس بناء حکم کو علت

ہے ان چیزوں میں سے جن کا حکم شریعت میں صراحتہً مذکور ہے کس کے
ساتھ زیادہ مشابہ ہے - اور یہ دیکھا جائے کہ اس چیز میں فہم سلیم کے
نزدیک کوئی ایسی بات ہے جس پر اس حکم کی بنا بظن غالب ہو سکتی ہے
(بظن غالب کی قید اس واسطے ہے کہ احکام شرعی کی بناء کسی بات پر یقین
کے ساتھ قائم کرنا صحیح نہیں جب تک کہ حضرت شارع ہی کی طرف سے
بیان نہ فرمایا گیا ہو - اس غلطی میں آج کل بہت لوگ مبتلا ہیں - نیز وہ چیز جس
حکم کی بنا حضرت شارع کی طرف سے بیان ہو چکی ہو ہمارے اس وقت
کی بحث سے خارج ہے کیونکہ وہاں قیاس کا کیا موقع ہے) پس اگر کوئی
ایسی بات مل جائے کہ اس پر بناء اس حکم کی بظن غالب ہو سکتی ہے
تو اب دیکھا جائے گا کہ وہ بات اس چیز میں بھی موجود ہے یا نہیں جس

---

[1] مماثل صفت ہے امر کی جیسا کہ منصوص الحکم بھی امر ہی کی صفت ہے معنے یہ ہوئے کہ جو حکم
اس چیز کا ہے جس کا حکم شریعت میں موجود ہے اور وہ چیز مشابہ ہے دوسری
چیز کے جس کا حکم صراحتہً موجود نہیں بوجہ اس مشابہت کے اس دوسری چیز
کے لئے بھی وہی حکم ثابت کیا جائے گا - ۱۲

اور اس اثبات حکم کو تعدیہ اور قیاس کہتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے
قیاس کی جس کا اذن شریعت میں وارد ہے جیسا اصولیین نے ثابت
کیا ہے

کا حکم صراحۃً شریعت میں نہیں ملتا اور اس کا حکم ہم نکالنا چاہتے ہیں۔ اگر وہ بات اس میں موجود ہے تو وہ حکم بھی اس کے لئے ثابت کیا جائے گا اس کا نام قیاس ہے۔ ہماری تقریر سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ قیاس کے لئے اتنی چیزوں کی ضرورت ہے اول وہ چیز جس کا حکم صراحۃً قرآن یا حدیث یا اجماع میں موجود ہے اس کو مقیس علیہ کہتے ہیں (یعنی وہ چیز جس پر دوسری چیز کو قیاس کیا گیا) دوم وہ چیز جس کا حکم قیاس سے نکالا گیا۔ اس کو مقیس کہتے ہیں (یعنی وہ چیز جس کو دوسرے پر قیاس کیا گیا) تیسری وہ بات جس پر مقیس علیہ کے حکم کی بنا بظن غالب سمجھی گئی اس کو علت کہتے ہیں (یعنی حکم کا سبب) چوتھے وہ حکم جو مقیس علیہ کے لئے تھا اس کو مقیس کے لئے ثابت کرنا۔ اس کو تعدیہ کہتے ہیں (یعنی حکم کو ایک چیز سے دوسری چیز تک پہنچا دینا) یہ سب چار چیزیں ہوئیں مقیس علیہ مقیس۔ علت۔ تعدیہ۔ اس تعدیہ ہی کا نام قیاس بھی ہے۔

یہ حقیقت ہے قیاس کی جس سے مجتہدین بعض ان احکام کو ثابت کرتے ہیں جن کی تصریح شریعت میں یعنی قرآن وحدیث و اجماع میں نہیں

ملتی اس کو ہمارے بھائی صحیح طور سے نہیں سمجھتے اور غلط اصطلاح کر کے وہم و گمان ہی کے درجہ میں لے آتے ہیں اور دین میں طرح طرح کی گڑ بڑ کرتے ہیں جیسا کہ آگے آتا ہے قیاس صحیح کے حجت ہونے کا ثبوت شریعت میں موجود ہے جس کو کتب اصول میں بالتفصیل بیان کیا گیا ہے۔ یہاں ہم بھی بقدر ضرورت بیان کرتے ہیں۔ قرآن میں جا بجا دیگر اقوام کے قصے بیان کر کے فرمایا گیا ہے:

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَعِبْرَۃً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ ط	یعنی اس میں عبرت ہے اہلِ نظر کے لیے۔
فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ ط	یعنی عبرت پکڑو اے اہلِ نظر۔
لَقَدْ کَانَ فِیْ قَصَصِهِمْ عِبْرَۃٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ۔	یعنی ان کے قصوں میں عبرت ہے اصحاب عقل کے لیے۔

عبرت پکڑنے کی یہی صورت تو ہے کہ دوسروں کے حالات میں غور کیا جائے کہ ان پر عذاب الٰہی آنے کی کیا وجہ ہوئی جب وہ وجہ معلوم ہو جائے تو دیکھا جائے کہ وہ بات ہم میں موجود ہے یا نہیں اگر ہے تو وہ حکم یعنی عذاب جو اُن پر آیا تھا اس کو اپنے واسطے بھی ثابت سمجھا جائے اور اس سے بچنے کی کوشش کی جائے۔ یہاں قیاس کے چاروں اجزا موجود ہیں (مقیس علیہ وہ) قوم ہے جس پر عذاب آیا، دوسرے (مقیس) ہم لوگ ہیں، علت حکم (عذاب کی وجہ) وہ فعل ہے جس کی بدولت (عذاب) آیا، اگر وہ علت

ہم میں موجود ہے تو اس کے اثر یعنی عذاب کو ہم تک متعدی سمجھنا چاہیئے یہ تعدیہ ہے جس کو قیاس کہتے ہیں امر فَاعْتَبِرُوْا سے قیاس کرنے کا وجوب اور حجت ہونا صاف ظاہر ہے - ایسی آیتیں قرآن پاک میں بہت ہیں جن سے قیاس کا حجت ہونا ثابت ہوتا ہے مثلاً

إِنَّآ أَرْسَلْنَآ إِلَيْكُمْ رَسُولًا
شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ أَرْسَلْنَآ
إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا فَعَصَىٰ
فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ
أَخْذًا وَبِيلًا فَكَيْفَ تَتَّقُونَ
إِن كَفَرْتُمْ

ہم نے بھیجا ہے تمہارے پاس ایک
رسول جو گواہ ہوگا تمہارے اوپر جیسے بھیجا
تھا ہم نے فرعون کے پاس ایک رسول پس
نافرمانی کی فرعون نے اس رسول کی
تو پکڑ لیا ہم نے اس کو سخت پکڑ میں
پھر تم کیسے بچو گے ہماری پکڑ سے - اگر
تم نے کفر کیا -

اس میں فرعون مقیس علیہ ہے اور مخاطبین آیت مقیس ہیں اور کفر علت مواخذہ و عذاب ہے اور مواخذہ و عذاب کو فرعون سے اپنی طرف درصورت اس علت کے موجود ہونے کے متعدی سمجھنے کا حکم ہے یہی قیاس ہے - آیتیں اس قسم کی صدہا موجود ہیں -

اب قیاس کے متعلق حدیث سنیئے - حدیثیں بھی بکثرت موجود ہیں - چنانچہ ہم اوپر بیان بھی کر آئے ہیں ان میں سے ایک حدیث کو بطور خلاصہ

دہراتے ہیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ
کو والی یمن بنا کر بھیجا تو فرمایا تم کیسے فیصلے کرو گے عرض کیا کتاب اللہ کے
موافق کروں گا فرمایا اگر کتاب اللہ میں کوئی حکم نہ ملے۔ عرض کیا حضور
کی سنت کے موافق کروں گا فرمایا اگر سنت میں بھی نہ ملے۔ عرض کیا پھر
میں اجتہاد کروں گا اور میں اس میں کوتاہی نہ کروں گا (یعنی خوب سوچ سمجھ کر
فیصلہ کروں گا) حضور نے اس پر بہت خوشی ظاہر فرمائی۔ اس اجتہاد کی
حقیقت کیا ہے اور اس میں کوتاہی نہ کرنے کے کیا معنے ہیں۔ اس کے
معنے یہی ہو سکتے ہیں کہ جب مجھے کتاب اللہ اور سنت میں صریح حکم نہ
ملے گا تو میں سوچوں گا کہ کوئی نظیر اس کی کتاب و سنت میں ہے یا نہیں
اس نظیر کی تلاش کرنے ہی کے متعلق کہا ہے کہ میں کوتاہی نہ کروں گا جب
نظیر مل جائے گی تو اس کا حکم پیش آمدہ واقعہ پر بھی جاری کروں گا یہی
قیاس ہے اس میں چاروں اجزاء مذکورہ قیاس کے موجود ہیں وہ
نظیر مقیس علیہ ہے اور واقعہ موجودہ مقیس ہے اور وجہ مشترک
علت ہے اور وجہ مشترک کی بناء پر اُس حکم کو مقیس پر جاری کرنا
یہ تعدیہ ہے اسی کا نام قیاس ہے اس قسم کی حدیثیں بہت ہیں۔
بعض کو ہم اوپر بھی لکھ آئے ہیں۔ راقم کہتا ہے کہ قیاس صرف حجت
شرعی ہی نہیں بلکہ ہر قانون ہر ملت ہر عرف میں موجود ہے اور بلا قیاس

کے کوئی کام نہیں چل سکتا۔ دیکھئے عدالتوں میں مقدمات ہائی کورٹ کے نظائر سے طے ہوتے ہیں نظیر کی موافق حکم کرنا سوائے قیاس کے کیا ہے جیسا کہ ہم ابھی بیان کر آئے ہیں ہائی کورٹ کا طے کردہ مقدمہ مقیس علیہ ہے اور عدالت ماتحت کا مقدمہ مقیس اور وجہ مشابہت علت اور ہائی کورٹ کے اصل مقدمہ کا حکم اس مقدمہ میں جاری کرنا تعدیہ ہے اسی کا نام قیاس ہے ہر ملت میں مقتداؤں کے زمانہ کے واقعات سے مابعد کے لوگ استدلال کرتے ہیں اس کا طریقہ وہی ہے کہ گزشتہ واقعات مقیس علیہ ہیں اور موجودہ واقعات مقیس اور دونوں میں وجہ مشابہت علت اور بوجہ اس مشابہت کے موجودہ واقعات میں گزشتہ واقعات کا حکم کرنا تعدیہ اور قیاس ہے عرف میں بچوں تک کو ہم دیکھتے ہیں کہ استاد کے ہاتھ سے ایک بچہ کسی شرارت پر پٹتا ہے تو سب بچوں کے کان ہو جاتے ہیں اور اس جیسی دوسری شرارت سے بھی ڈر جاتے ہیں یہ قیاس ہی ہے یا کچھ اور۔ وہ شرارت مقیس علیہ ہے اور دوسری شرارتیں مقیس اور دونوں میں وجہ مشابہت علت اور اس حکم کا ان پر جاری سمجھنا تعدیہ اور قیاس ہے اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ قیاس امر فطری ہے جس پر بچے تک بھی عامل ہیں بلکہ ترقی کر کے کہا جا سکتا ہے کہ جانوروں میں بھی عمل بالقیاس کا مادہ موجود ہے ایک شرارت پر جانور مار کھاتا ہے۔ تو دوسری قسم کی شرارت سے بھی رک جاتا ہے اس میں

وہی تقریر جاری ہوتی ہے کہ وہ شرارت جس پہ وہ جانور پٹا ہے مقیس علیہ
ہے اور نئی شرارت مقیس اور دونوں شرارتوں میں باہم کچھ مشابہت ضرور ہے
یہ علت ہے اور اس علت کی بنا پر نئی شرارت پر شرارتِ اول کے حکم یعنی
مار پٹنے کے جاری ہو جانے کو مرتب سمجھ لینا یہ تعدیہ ہے اسی کا نام قیاس
ہے۔ ثابت ہو گیا کہ قیاس امر فطری ہے اور بچے اور حیوانات تک بھی اس پر
عامل ہیں۔ اور اس زمانہ میں جس پہ دنیا عشق ہے یعنی صنعت و حرفت و ایجاد
اس کی بنا کس چیز پر ہے صرف قیاس پر کیونکہ ایجاد اسی طرح ہوتی ہے کہ ایک
چیز میں ایک اثر موجود ملا اب اہل تجربہ غور کرتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اس
اثر کی ضرور کوئی علت ہے جو علت صحیح یا غلط سمجھ میں آتی ہے اس کو دوسری
چیز میں تلاش کرتے ہیں۔ بسا اوقات اس میں بھی وہ علت مل جاتی ہے
اور بسا اوقات نہیں ملتی۔ اگر مل جاتی ہے تو ظن غالب ہو جاتا ہے کہ وہ اثر
بھی اس چیز میں ضرور ہو گا جو شے اول میں ہے اس کا تجربہ کرتے ہیں اور اکثر
کامیابی ہوتی ہے بس ایک نئی عجیب چیز ایجاد ہو جاتی ہے۔ مثلاً ریل کی ایجاد
بھاپ سے ہوئی بھاپ میں قوتِ تحریک پائی گئی جیسے بیل میں یا گھوڑے میں
قوتِ تحریک ہے کہ گاڑی کو کھینچ سکتا ہے جس کا شروع اس طرح ہوا تھا کہ
ایک ہانڈی پک رہی تھی آنچ تیز ہوئی تو اس کا سرپوش اچھلنے لگا ثابت
ہوا کہ بھاپ میں اتنی قوت ہے کہ کسی چیز کو حرکت دے سکتی ہے اُس

بھاپ کو بند کر کے تیز کیا گیا اور اس کے سامنے جو ثقیل کی ایسی مشین رکھی گئی جو ذرا سی حرکت سے بہت قوی حرکت پیدا کر سکتی ہے اس سے گاڑی چل نکلی پھر اس میں رفتہ رفتہ وہ ترقیاں ہوئیں جو دنیا کے سامنے ہیں یہاں بیل یا گھوڑا مقیس علیہ ہے اور بھاپ مقیس اور قوت تحریک وجہ مشترک ہے اس سے جیسے بیل یا گھوڑے سے گاڑی چلتی ہے بھاپ سے گاڑی چلا لینا قیاس کا نتیجہ ہے پھر اس کے بعد بجلی ایجاد ہوئی اس طرح کہ کہربا میں اور ہر چیز میں گرمی پہنچنے سے یہ اثر دیکھا کہ ذرا سے تنکے کو کھینچ لیتی ہے اس سے پتہ چلا کہ کہربا میں اور گرم چیز میں قوت تحریک ہے گو صرف اسی قدر ہے کہ ایک تنکے کو حرکت دے سکتی ہے۔ تو اب وہی اثر ثابت ہوا جو بھاپ میں تھا یعنی حرکت دینا خیال ہوا کہ اس قوت جاذبہ کو قوت کیوں نہیں دی جا سکتی جیسا کہ بھاپ کو قوت دی گئی جس سے گاڑی چلنے لگی چنانچہ تھوڑے تجربہ سے اس میں کامیابی ہوتی نظر آئی اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ بجلی سے ٹریم ویسے چلنے لگی پھر بڑی سے بڑی مشینیں چلنے لگیں اور وہ کرشمے ظاہر ہوئے جن کو دیکھ عقل حیران ہوتی ہے اور بہت سی وہ چیزیں مشاہدہ میں آگئیں جن کو کسی وقت میں ناممکن سمجھا جاتا تھا۔ یہ سب کس چیز کی بدولت ہوا صرف قیاس کی بدولت یہاں چاروں اجزاء قیاس کے موجود ہیں بھاپ مقیس علیہ ہے اور بجلی مقیس اور قوت محرک علت

ہے اور بنا بر اس علت کے بجلی سے وہ کام لینا جو بھاپ سے لیا جاتا تھا تعدیہ اور قیاس ہے ہماری اس تقریر سے ثابت ہوا کہ قیاس نہایت مفید اور ضروری چیز ہے اور اس کی ضرورت و منفعت بداہتہً و فطرۃً ثابت ہے۔ اگر شریعت نے اس کا اذن دیا تو عین مطابق فطرت ہے اور :

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا — اللہ کی تخلیق جس پر انسانوں کو پیدا کیا۔

کا ایک مصداق ہے۔ غرض قیاس سے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ جب قیاس کا اذن بلکہ امر قرآن و حدیث سے ثابت ہو گیا تو نتیجہ اس کا یہ ہے کہ جو حکم قیاس سے ثابت ہوتا ہے وہ درحقیقت قرآن و حدیث ہی کا حکم ہے جو پہلے مخفی تھا قیاس سے اس کا ظہور ہو گیا اسی واسطے کہا جاتا ہے کہ قیاس مظہر ہے مثبت نہیں اب اسی تقریر کے دوسرے رخ کو بھی ملاحظہ کیجئے وہ یہ ہے کہ کیا ہر قیاس مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے اور کیا بلا کسی قید و شرط کے اس کا استعمال کوئی اچھا نتیجہ پیدا کر سکتا ہے۔ جواب یقیناً نفی میں ہے اول مادیات میں دیکھئے کہ اگر ریل کے موجد نے ہانڈی کے سرپوش کو اچھلتے دیکھ کر بلا سوچے سمجھے اپنا ہاتھ پکتی ہوئی ہانڈی کے اندر ڈال دیا ہوتا یہ دیکھنے کے لئے کہ یہ میرے ہاتھ کو بھی ہٹا سکتی ہے یا نہیں تو

یقیناً وہ نقصان اٹھاتا اور آئندہ کے تجربات سے بھی رہ جاتا۔ یا بجلی کا موجد بجلی کی قوت کا امتحان اپنے جسم پر کرتا تو کوئی کارآمد بات حاصل نہ ہوتی بلکہ جان سے جاتا رہتا۔ بہت سوچ سمجھ کر قدم بڑھایا گیا تب کارآمد نتائج حاصل ہوئے اور مضرتوں سے حفاظت رہی۔ اس سے زیادہ واضح مثال یہ ہے کہ ایک بچہ یہ سن کر کہ کسی موجد نے بارود کو شورہ اور گندھک اور کوئلہ ملا کر بنایا ہے اور اس میں اور ایجادیں بھی ہوئی ہیں مثلاً بلا دھوئیں کی بارود اور پانی سے خراب نہ ہونے والی بارود بھی تیار ہو چکی ہیں۔ اب یہ بچہ بھی موجد بننے لگے اور بلا لحاظ اس بات کے کہ نقصان نہ پہنچے پٹاس اور منسل کو بھی بارود میں شامل کر کے پیسنے لگے اور کوئی تجربہ کار اس سے کہے کہ ایسا نہ کرو نقصان کا اندیشہ ہے اور وہ اس کا جواب یہ دے کہ واہ تم ترقی سے روکتے ہو فلاں سائنس دان نے مختلف تجربے کئے اور فلاں نے ایسا ایسا کیا اور کامیابی اور ترقی حاصل کی۔ غرض وہ کسی کی نہ سنے اور بارود میں منسل اور پٹاس کو ملا کر پیس ڈالے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ تمام بارود میں آگ لگ جائے اور سب کام خراب اور لاگت برباد ہو جائے اور خود بھی اسی میں جل کر ہلاک ہو جائے۔ تو اہلِ عقل اس کے متعلق کیا کہیں گے یہ نتیجہ کس چیز کا ہے قیاس کو بے سوچے سمجھے اور بلا لحاظ شرائط کے استعمال کرنے کا۔ ثابت

ہوا کہ ہر قیاس مفید نہیں ہو سکتا اس کے لئے بھی کچھ شرائط ہیں۔ یہی حال قیاس کا ذہن کے بارہ میں سمجھ لیجئے کہ مطلقاً قیاس کارآمد نہیں بلکہ اس کے لئے کچھ شرائط ہیں کہ بلا ان کے قیاس بیکار بلکہ مضر ہے اور اسی وجہ سے ایسا قیاس ناجائز ہے۔ وہ شرائط یہ ہیں۔ سب سے اول تو قیاس کی ماہیت کا سمجھنا ہے آج کل اسی میں ایسا خبط ہوا ہے کہ اٹکل کا نام قیاس رکھا ہے یہ غلط اصطلاح ہے دوسری شرط محل قیاس کو سمجھنا ہے۔ تیسری شرط قیاس کی اہلیت ہونا چوتھی شرط قیاس کی غرض کو سمجھنا۔ ان چاروں میں سے اول الذکر یعنی ماہیت قیاس کا بیان مشرح ہو چکا۔ دوسری شرط کا بیان یہ ہے کہ محل قیاس وہ حکم ہے جس میں نص صریح موجود نہ ہو۔ کیونکہ حدیث میں گزر چکا ہے۔

فان لم تجد فی سنۃ رسول اللہ قال اجتہد برأیی	یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ سے فرمایا اگر سنت میں بھی نہ ملے غرض کیا اس صورت میں اجتہاد کروں گا۔

بلفظ دیگر قیاس سے کام لوں گا۔ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا۔ معلوم ہوا کہ قیاس اسی صورت میں جائز ہے کہ نص موجود نہ ہو پس اگر باوجود نص موجود ہونے کے قیاس کیا گیا تو سخت غلطی ہو گی اس غلطی

پس درحقیقت مثبت حکم نص ہی ہے۔ قیاس اس کا محض مظہر ہے۔

کا خلاصہ محل قیاس کو نہ سمجھنا ہے۔ یہاں سے ایک اور شرط بھی نکل آئی وہ یہ کہ قیاس کرنے والا اس کا اہل بھی ہو اس طرح کہ وہ دین کا پورا عالم ہو کیوں کہ بلا اس کے یہ کیسے معلوم ہوگا کہ اس حکم میں نص نہیں ہے اور صرف رسمی عالم نہیں بلکہ ذوق صحیح اور کامل رکھتا ہو اسی کو درجۂ اجتہاد کہتے ہیں جو حسب تحقیق علمار حقانی کے ختم ہو چکا اور اب کوئی اس کا اہل نہیں۔ اس پر شاید تعجب کیا جائے اور کہا جائے کہ علم کے ختم ہو جانے کی دلیل ہے چنانچہ بعض متبعین ہوا کی زبانوں پر یہ لفظ آتا ہے کہ یہ علمار کا جمود ہے کہ اب کوئی مسئلہ قرآن وحدیث سے نہ نکالو بس سلف کے اقوال پر چلو۔ جب کہ قرآن تمام سلف وخلف کے لئے اترا ہے تو سلف تک اس کو محدود کر دینا کیا معنے رکھتا ہے یہ کہاں آیا ہے کہ قرآن سلف کے لئے ہے اسی طرح حدیث۔ اس کا جواب یہ ہے کہ علم محیط اور ذوق صحیح جو اجتہاد کی بنا ہے وہ اب نہیں رہا اس واسطے اجتہاد بھی نہیں رہا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس وقت دنیا بھر میں سے کوئی بڑے سے بڑا عالم بلکہ دو چار عالم منتخب کر کے سو مسائل ان کے سامنے پیش کئے جائیں اور یہ شرط ہے کہ وہ فقہ کی کتابوں کو نہ دیکھیں اور ان مسائل کے جواب

قرآن وحدیث سے مدلل لکھیں جب یہ تحریر مکمل ہو چکے تو اس کو فقہ کی کتابوں سے ملایا جائے ہمارا دعوے ہے کہ ان کے استدلالات اور جوابات بلکہ عبارات بھی فقہ کے سامنے بالکل لغو اور مہمل ثابت ہوں گے اور لکھنے والے خود اپنی تحریر دل پر ہنسیں گے۔

فمن شاء فلیفعل — جو کوئی چاہے کرکے دیکھ لے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خلف کا علم سلف کی برابر ہرگز نہیں ہے اس صورت میں اگر ہم اجتہاد[1] کے ختم ہو جانے پر اس آیت سے استدلال کریں تو غالباً بے جا نہیں ہے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ — یعنی کیا برابر ہو سکتے ہیں وہ لوگ جو علم رکھتے

وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ط — ہیں اور وہ لوگ جو علم نہیں رکھتے۔

جب کہ خلف سلف کے سامنے لا یعلمون میں داخل ہیں تو ان کو سلف کی برابر کیسے کیا جا سکتا ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ سلف علم میں خلف سے بڑھے ہوئے تھے اور وہ درجہ علم کا ان پر ختم ہو گیا:

ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء — یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسکو چاہے دیدیتا ہے

---

[1] اجتہاد کے متعلق علماء نے مبسوط رسالے لکھے ہیں اس زمانہ میں حضرت حکیم الامت مدظلہٗ کا رسالہ الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد بہترین کتاب ہے ۱۲ منہ

دیکھو فن روایت حدیث محدثین سلف پر ختم ہو گیا جس کے سب قائل ہیں پھر اجتہاد کے ختم ہو جانے پر تعجب کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ غرض اصل مسئلہ تو یہی ہے کہ علم محیط اور ذوق صحیح ہو تو یہ معلوم کرنے کے بعد کہ اس مسئلہ میں نص نہیں ہے۔ قیاس کی اجازت ہے لیکن تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ اب علم محیط اور ذوق صحیح موجود نہیں لہذا اب قیاس کی اجازت ہی نہیں اور اگر بالفرض کوئی اس کا مدعی پیدا ہو تب بھی مصلحت عامہ اسی میں ہے کہ اجتہاد نہ شروع کیا جائے جیسا کہ آگے آتا ہے۔ غرض یہ تو صریح غلطی ہے کہ اہل و نااہل سب کو قیاس کی اجازت دی جائے۔ یہ غلطی قیاس کے اہل کے متعلق ہے۔

اور قیاس کی غرض کا پہچاننا بھی شرط ہے۔ یہ ایسی بات ہے کہ کوئی بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا جو کام بھی غایت و غرض سے خالی ہے وہ لغو اور مضر ہو جاتا ہے مثلاً تجارت سے غرض تحصیل مال ہے اگر کسی تجارت میں یہ غرض حاصل نہ ہو تو اس میں پڑنا حماقت ہے۔ قیاس سے غرض غیر منصوص چیز کا حکم نکالنا ہے بس یہیں تک اس کو محدود رکھنا چاہیئے۔ منصوص چیزوں تک قیاس کو پہنچانا یعنی بلا ضرورت تعدیہ احکام صریحہ کی علتیں نکالنا اور ان علتوں پر مدار حکم رکھنا اس طرح

سے کہ جہاں وہ علت نہ ہو حکم کی نفی کر دی جائے ناجائز اور دین میں تحریفی تصرف ہوگا۔

یہاں تک قیاس کی ماہیت اور اس کے حجت ہونے کا ثبوت اور شرائط کا بیان ہوا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح آج کل کے لوگ قیاس کا استعمال کرتے ہیں نہ وہ قیاس شرعی ہے کیوں کہ اس کے ارکان[1] ہی موجود نہیں نہ وہ حجت ہو سکتا ہے نہ وہ جائز ہے اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ایک رائے ہے جس کو ہر شخص اپنی مصلحت کی موافق اختراع کر لیتا ہے اس کا درجہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا کہ ایک بہت بڑے جج کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہو اور وہ بہت غور و خوض سے مدلل فیصلہ لکھ کر سنائے اور ملزم کو سزا کر دے اس کے مقابلہ میں ایک جاہل گنوار کہے کہ ہمارا خیال اس کے خلاف ہے اور ملزم کو بری کرنا چاہئے اور دلیل یہ ہے کہ اس سے پہلے جو اسی جگہ پر جج صاحب تھے وہ اکثر ملزموں کو چھوڑ دیا کرتے تھے تو کیا اس رائے کی کسی عقلمند کے نزدیک کوئی وقعت ہو سکتی ہے حالانکہ یہ بھی ایک قیاس ہے کیوں کہ وہ موجودہ جج کو سابق جج پر قیاس کر کے کہتا ہے کہ جیسے وہ جج تھے ایسے ہی یہ جج ہیں جو اختیارات اُن کے تھے وہی ان کے ہیں وہ ملزم کو چھوڑ دیتے تھے ان کو بھی چھوڑ دینا چاہیئے سب جانتے ہیں کہ یہ قیاس

---

[1] یعنی مقیس علیہ اور مقیس اور علت اور تعدیہ ۱۲

اب جس قیاس کا استعمال کیا جاتا ہے اس کی حقیقت صرف رائے محض ہے جس میں استناد الی النص بالطریق المذکور نہیں ہے جس کو خود بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں چنانچہ محاورات میں بولتے ہیں کہ ہمارا یہ خیال ہے ۔ سو حقیقت میں یہ تو مستقل شارع (شریعت بنانیوالا ۱۲) بننے کا دعویٰ ہے جس سے قبح (برائی ۱۲) عقلی ثابت ہے ۔ اور اس رائے کی مذمت (برائی ۱۲) نصوص و اقوال اکابر میں آئی ہے جس سے قبح (برائی ۱۲) نقلی ثابت ہوتا ہے تو عقلاً و نقلاً دونوں طرح یہ مذموم ہوا ۔

معتبر نہیں اور بمقابلہ اس کے ایک وہ قیاس ہے جس سے وکلاء اپیل کے وقت کام لیتے ہیں اور بڑے سے بڑے قابل جج کا حکم عدالت عالیہ سے ایک نظیر پیش کر کے خارج کرا دیتے ہیں دونوں قیاس ہی ہیں لیکن ایک مردود ہے اور ایک مقبول دونوں میں کچھ تو فرق ہے اور وہ ایسا فرق ہے جس کو عقلاء زمانہ بھی تسلیم کرتے ہیں ۔ اگر ہمارے بھائی غور کریں گے تو آج کل کے قیاسوں میں اور سلف کے اور علماء حقانی کے قیاسوں میں وہی فرق پائیں گے جو اس گنوار کے قیاس میں اور وکلاء کے قیاس میں ہے ۔ اب یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ بے قاعدہ قیاس عقلاً بھی برا اور ناجائز ہے اس قیاس کی حقیقت حضرت مصنف مدظلہ نے یہ ارشاد فرمائی ہے کہ یہ مستقل شارع بننا ہے یہ بالکل صحیح ہے کیوں کہ جب یہ قیاس وہ نہیں

ہے جس کی اجازت حضرت شارعؑ نے دی ہے تو حضرت شارعؑ کا اتباع نہ ہوا بلکہ اپنی طرف سے ایک ایجاد ہوئی اور یہی شارع بننا ہے تو جو شخص اتباع شارعؑ کا مدعی ہے اس سے ایسا فعل ہونا جو شارع بننے کو مستلزم ہو خلاف عقل نہیں تو کیا ہے اس بے قاعدہ قیاس کو ہوائے نفسانی اور رائے کہتے ہیں اس کی برائی آیات واحادیث اور علماء حقانی کے اقوال میں بھی موجود ہے اور اس کثرت سے موجود ہے کہ بیان کی بھی ضرورت نہ تھی قرآن وحدیث کا ترجمہ دیکھنے سے اور دین کی اردو کتابیں پڑھنے سے بھی مل سکتی ہے مگر ہم بھی کچھ بطور نمونہ لکھے دیتے ہیں چند آیات یہ ہیں:

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ	اور نہ اتباع کرو ہوائے نفسانی
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط	ورائے کی کہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ تم
اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ	کو خدائے تعالیٰ کی راہ سے بھٹکا دے گی اور
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ	جو لوگ خدائے تعالیٰ کی راہ سے بھٹک
عَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا	جاتے ہیں ان کے واسطے سخت عذاب
نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ط	ہے اس وجہ سے کہ وہ یوم حساب
	(قیامت) کو بھول گئے۔

معلوم ہوا کہ رائے کا اتباع گمراہی ہے اور یہ آخرت کو بھول جانے سے

پیدا ہوتا ہے اور اس پر سخت عذاب کی وعید ہے ۔ یہ نصیحت حق تعالےٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو فرمائی ہے اس سے یہ حکم اور زیادہ مہتم بالشان ہو گیا کہ اتنے بڑے پیغمبر کو بھی اس سے بے خوف نہ رہنا چاہیئے ؛

دوسری آیت :

اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ	تم نے اس شخص کی حالت دیکھی جس
هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ	نے اپنا خدا اپنی ہوائے نفسانی (رائے)
عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى	کو بنا رکھا ہے اور اس کو خدائے تعالےٰ
سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ	نے باوجود علم ہونے کے (یعنی باوجودیکہ
عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً	وہ سمجھتا بوجھتا آدمی ہے) گمراہ کر دیا ہے
فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ	اور اس کے کان اور دل پر حق تعالےٰ نے
بَعْدِ اللّٰهِ	مہر کردی ہے (کہ وہ اب حق بات کو سن سکتا ہے نہ
	سمجھ سکتا ہے) اور اسکی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے
	اب اس کو کون ہدایت کر سکتا ہے حق تعالےٰ
	کے بعد ؟

اس آیت سے ثابت ہوا کہ رائے پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کو حق تعالےٰ گمراہ کر دیتے ہیں پھر اس میں حق بات کے سننے سمجھنے دیکھنے کی استعداد بھی نہیں رہتی ۔ لفظ عَلٰى عِلْمٍ[1] ہمارے تعلیم یافتہ بھائیوں کے لئے کس قدر

---

[1] باوجود علم کے ۱۲

عبرت ناک ہے۔

تیسری آیت اوپر سے ذکر ہے کہ لات وعزّیٰ ومنات جو بت ہیں یہ کوئی چیز نہیں ہیں

إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ	ان کو تم نے اور تمہارے آبا نے
سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ	گھڑ رکھا ہے حق تعالیٰ نے ان کی
وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ	پرستش کا حکم نہیں دیا۔ یہ لوگ نہیں پیرُوا
بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنْ	کرتے مگر وہم وگمان کی اور
يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا	ہوائے نفسانی (رائے) کی حالانکہ
تَهْوَى الْأَنْفُسُ وَلَقَدْ	ان کے پاس ان کے پروردگار
جَاءَهُمْ مِنْ رَبِّهِمُ	کی طرف سے ہدایت آچکی۔
الْهُدَىٰ۔	

اس قسم کی آیتیں بے شمار موجود ہیں۔

اب چند حدیثیں بھی مذمت ہوائے نفسانی کے متعلق سنیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بہت سے عیوب بیان فرمائے ان میں یہ بھی ہیں:

بِئْسَ الْعَبْدُ عَبْدٌ سَهَىٰ	بُرا بندہ ہے وہ بندہ جو بھول
وَلَهَا وَنَسِيَ الْمَقَابِرَ	میں پڑا اور لہو ولعب میں پڑا رہا

لـ از جمع الفوائد کتاب الخوف والرقاق جلد ۲ صفحہ ۲۶۵

وَ الْبِلٰی ۔ بِئْسَ اَلْعَبْدُ
عَبْدٌ هُوًى يُضِلُّهٗ بِئْسَ
اَلْعَبْدُ عَبْدٌ رَغَبٌ يُذِلُّهٗ

اور بھلا دیا اس نے قبروں کو اور گل سڑ جانے کو ۔ برا بندہ ہے وہ بندہ کہ اس کو ہوائے نفسانی گمراہ کر رہی ہے برا بندہ ہے وہ بندہ کہ لذتیں اس کو ذلیل کر رہی ہیں۔

ظاہر ہے کہ جس کی برائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں اس میں کیا بھلائی ہو سکتی ہے ۔

دوسری حدیث:

إِذَا رَأَيْتَ شُحًّا مُطَاعًا
وَ هَوًى مُتَّبَعًا وَ إِعْجَابَ
كُلِّ ذِي رَأْيٍ بِرَأْيِهٖ
فَعَلَيْكَ بِنَفْسِكَ
خَاصَّةً ۔

جب دیکھو حرص حکمراں (جس کے پیچھے لوگ اندھے بہرے ہو کر دوڑنے لگیں) اور خواہش نفسانی متبوع (جس کے پیچھے بے سوچے سمجھے چلنے لگیں) اور نازاں ہونا ہر شخص کا اپنی رائے پر تو ایسے وقت میں صرف اپنی اصلاح کی کوشش کرو (دوسرے کی اصلاح کے پیچھے نہ پڑو)

اس حدیث سے راستے کی کس قدر مذمت ثابت ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے تبلیغ جیسے فرض کو بھی ساقط کیا گیا جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ مرض لاعلاج ہے بعینہ ایسا ہے جیسے ایک ڈاکٹر کسی پھوڑے کے متعلق کہہ دے کہ اس کا اپریشن فضول ہے بس اب یہ مرض تو لاعلاج ہے دیگر بیماروں کو چاہیئے

کہ اپنی اپنی حفاظت کریں کہ یہ مرض ان تک متعدی نہ ہو جائے۔ اس قسم کی حدیثیں صدہا ہیں۔

اور اکابر کے اقوال میں تو دفتر کے دفتر مذمت ہوئی ہیں موجود ہیں۔ حافظ فرماتے ہیں ؎

فکر خود و رائے خود در عالم رندی نیست
کفر است دریں مذہب خود بینی و خود رائی
(عشق ۱۲)

وقال المعارف الرومی ؎

با ہوا و آرزو کم باش دوست
چوں یضلک عن سبیل اللہ اوست

حضرات مشائخ صوفیہ کے یہاں تو پہلا قدم رائے کا فنا کر دینا ہے دیکھئے ابلیس نے اپنی رائے پر عمل کیا جو انجام ہوا دنیا کو معلوم ہے حالانکہ اس کی رائے دلیل کیسا نہ تھی وہ یہ کہ میں آگ سے پیدا ہوا ہوں اور آدم مٹی سے اور آگ کا تیز اور روشن ہونا اور مٹی کا سست اور تاریک ہونا ظاہر ہے۔ لیکن ابلیس نے غلطی یہ کی کہ نص صریح (حکم الٰہی) کے ہوتے ہوئے قیاس کیا۔ بلفظ دیگر محل قیاس کے متعلق غلطی کی تو یہ قیاس قیاس صحیح نہ رہا اور محض رائے کے درجہ میں آگیا اور اس کی وجہ سے ابلیس ملعون و مردود ہوا غرض قرآن و حدیث و اقوال اکابر سے رائے کی مذمت ثابت ہے اور

دوسری غلطی محل قیاس میں ہے یعنی اوپر کی تقریر سے معلوم ہوا ہوگا کہ
قیاس کی ضرورت محض امور غیر منصوصہ (جن میں تصریح نہ ہو ۱۲) میں ہوتی ہے اور اس میں تعدیۂ
حکم کے لئے منصوص میں ابدار (ظاہر کرنا ۱۲) علت کی حاجت ہوتی ہے تو بدون ضرورت
تعدیہ حکم کے منصوص میں علت نکالنا جائز نہ ہوگا اب غلطی یہ کی جاتی
ہے کہ منصوص میں بھی بلا ضرورت علت نکال کر خود حکم منصوص کو وجوداً

عقلاً اور عرفاً بھی ثابت ہے تو نقلاً عقلاً و عرفاً رائے پر عمل کرنا غلطی ہے۔

ہماری یہاں تک کی تقریر سے حضرت مصنف مدظلہ کی تحریر متعلق قیاس کی پوری ترجمانی ہوگئی چونکہ ترتیب ابحاث میں کچھ فرق ہوگیا اس واسطے ہم متن کے جملوں کی شرح تھوڑی تھوڑی پھر کرتے ہیں۔

قولہ دوسری غلطی الخ اس کا حاصل یہ ہے کہ جب طے ہو چکا کہ قیاس اس واسطے کیا جاتا ہے کہ جس چیز کا حکم شریعت میں صراحۃً موجود نہ ہو اس کا حکم کسی صریح نظیر شرعی سے نکال لیا جائے اس ضرورت سے اس نظیر میں غور کر کے بظن غالب کوئی وجہ نکال کر اس چیز کا حکم نکال لیا جاتا ہے یعنی جو حکم اس نظیر کا تھا وہ اس چیز کی طرف بھی متعدی کر لیا جاتا ہے حاصل یہ کہ یہ فعل یعنی وجہ (علت نکالنا) حکم شرعی میں بضرورت ہوا جس کی اجازت بلکہ مشروعیت خود شریعت . . . . . . سے ثابت ہے (جیسا کہ اوپر مشرح بیان ہو چکا) تو اس صورت میں قیاس کا محل صرف وہ چیز ٹھہری

وعدماً اس کے وجود وعدم پر دائر کرتے ہیں جیسا اشتباہ سوم کی چھٹی
غلطی کے بیان میں مذکور ہوا ہے اور اسی سے ایک تیسری غلطی بھی معلوم ہو گئی
یعنی غرض قیاس میں کہ غرض اصلی تعدیہ ہے غیر منصوص میں نہ کہ تصرف منصوص میں۔

جس کا حکم شریعت میں صراحۃً موجود نہیں ہے۔ تو اگر ایسی صورت موجود نہ ہو یعنی کوئی مسئلہ قیاس سے ثابت کرنا نہیں ہے تو خواہ مخواہ احکام شرع میں علتیں پیدا کرنا جائز نہ ہوگا آج کل اس کا بہت چرچا ہے ان احکام میں بھی علتیں نکالی جاتی ہیں جو صراحۃً شریعت میں موجود ہیں جیسے نماز، روزہ وغیرہ۔ نماز کی غرض روزہ کی غرض حج کی غرض زکوٰۃ کی غرض ہر حکم کی غرض تراشی جاتی ہے اور اس پر ایسا وثوق کیا جاتا ہے کہ وجوداً و عدماً ان احکام کا مدار انہیں اغراض پر سمجھا جاتا ہے جہاں وہ وجہ موجود نہ ہو حکم بھی ساقط سمجھا جاتا ہے مثلاً وضو کی علت صفائی اور نماز کی علت تہذیب اخلاق اور حج کی علت جفاکشی اور تبادلۂ خیالات۔ وغیرہ وغیرہ تراش رکھی ہیں تو اگر صفائی اور تہذیب اخلاق اور جفاکشی دیگر کسی طریق سے بزعم خود حاصل ہو سکے تو ان عبادات کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ یہ جائز نہیں کیونکہ یہ قیاس بے محل ہے اس کی مکمل تردید اشتباہ سوم متعلق نبوت میں چھٹی غلطی کے بیان میں ہو چکی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ سب دعوے بلا دلیل ہیں پھر یہ کہ ایک شخص کوئی علت نکالے گا اور دوسرا کچھ اور نکالے گا۔ تو کس کو صحیح سمجھا جائے۔

چوتھی غلطی قیاس کے اہل میں ہے یعنی ہر شخص کو اس کا اہل سمجھتے ہیں جیسا کہ بعض اہلِ جرأت کے لیکچروں میں تصریح دیکھی گئی ہے کہ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ نے اجتہاد کو ہر شخص کے لئے عام کر دیا ہے حالانکہ علماء اصولیین نے بدلائل قویہ اجتہاد کے شرائط کو ثابت کر دیا ہے جس سے عموم باطل ہوتا ہے اور لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ کے یہ معنے بھی نہیں ہیں اور موٹی بات یہی ہے کہ ہر شخص اس کا اہل نہیں ہو سکتا کیونکہ جو حاصل حقیقت قیاس و اجتہاد کا اوپر

ابلیس نے حکم صریح میں علت نکالی اور مسجودیت کی علت رفعت کو سمجھا جو نار کو بمقابلہ مٹی کے حاصل ہے لہذا آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کیا اس پر لعنت کی گئی۔ قولہ اور اسی سے ایک تیسری غلطی بھی معلوم ہو گئی۔ یعنی غرض قیاس میں الخ۔ دوسری اور تیسری غلطی لازم و ملزوم ہیں ان کو دو کہنا ایسا ہے جیسے مجسٹریٹ ایک واقعہ میں مقدمہ قائم کرتے وقت کئی دفعہ لگاتا ہے اور ہر دفعہ کے رو سے ایک ایک سزا کرتا ہے حالانکہ کہنے کو ایک مقدمہ ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی کہنے کو ایک ہی بات ہے کہ قیاس کو بے محل استعمال کیا گیا کہ صریح احکام تک اس کو بڑھا دیا لیکن درحقیقت اس میں دو غلطیاں ہو گئیں قیاس بے محل اور فوت غرض۔

قولہ چوتھی غلطی قیاس کے اہل میں ہے الخ یہ ایسی فاش غلطی ہے کہ بقول شخصے جولاہے کی لونڈیا بھی اس کو سمجھ سکتی ہے تعجب ہے کہ آج کل ہمارے

مذکور ہوا ہے اس کی نظیر وکلاء کا کسی مقدمہ کو کسی دفعہ کے تحت میں داخل
کرنا ہے سو ظاہر ہے کہ اگر ہر شخص اس کا اہل ہو تو وکالت کے پاس کرنے
ہی کی حاجت نہ ہو پس جس طرح یہاں شرائط ہیں کہ قانون پڑھا ہو یاد بھی ہو۔

تعلیم یافتہ بھائی اس میں مبتلا ہیں حضرت مصنف مدظلہ نے کیا ہی واضح
نظیر سے اس کو حل کیا ہے کہ وکلاء مقدمہ کو کسی قانونی دفعہ کے تحت میں داخل
کر کے پیروی کرتے ہیں۔ کیا ہر شخص یہ کام کر سکتا ہے جواب بالیقین نفی میں ہے
ورنہ وکالت کے پیشہ کا وجود ہی نہ ہوتا حالانکہ معمولی وکیل بھی پورے طور پر مقدمہ
نہیں لڑا سکتا وہی وکیل مقدمہ لڑا سکتا ہے جس کو قانون خوب یاد ہو مشاق
ہو دماغ اعلیٰ درجہ کا رکھتا ہو قانون کی غرض کو بھی سمجھتا ہو مقدمہ کے باریک
پہلوؤں کو بھی پہچانتا ہو۔ یہ وہی درجہ ہے جس کو درجۂ اجتہاد کہتے ہیں۔ جب
اس قانون میں یہ حالت ہے جو ہم ہی جیسے انسانوں کا بنایا ہوا ہے کہ
معمولی وکیل بھی اجتہاد نہیں کر سکتا بلکہ بڑی قابلیت اور مشق و مہارت کی ضرورت
ہے تو اس قانون میں جو خدا کا بنایا ہوا ہے اجتہاد کی اجازت ہر شخص کو کیسے
ہو سکتی ہے۔ غضب یہ ہے کہ اس دعوے پر اس آیت سے استدلال
کیا جاتا ہے لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ تمہارے واسطے
. . . . . تمہارا دین ہے اور میرے واسطے میرا دین۔
راقم کہتا ہے کہ جب یہ بات ٹھہری تو دین کے بارہ میں کسی قابلیت

اور کسی درجہ کے علم وغیرہ کی ضرورت نہ رہی ہر اَن پڑھ جاہل مطلق اجتہاد کر سکتا ہے اور دین کے تمام اجزاء یعنی عقائد و اعمال و معاملات و معاشرت وغیرہ سب میں جس بات کو چاہے اپنے فہم کے موافق اختیار کر سکتا ہے تو نعوذ باللہ اس آیت کے اترنے کے بعد کسی امر و نہی کی ضرورت نہ رہی جو بھی کام کیا جائے گا دین کے خلاف نہ ہوگا۔ اور راقم کہتا ہے کہ اس آیت سے عموم اجازت اجتہاد پر استدلال کرنا اپنی بیوقوفی کا ثبوت دینا ہے کیونکہ یہ بھی نہیں دیکھا کہ ضمیر کُمْ کا مرجع کون ہے اور ان آیتوں میں خطاب کس کو ہے۔ شروع سورت سے خطاب کفار کو چلا آ رہا ہے؛

قُلْ یَا اَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ — آپ فرما دیجئے کہ اے کافرو! نہ میں عبادت

لَا اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ الخ — کرتا ہوں اس کی جس کی تم کرتے ہو۔ الخ

جس قدر ضمیریں خطاب کی ہیں سب کفار ہی کی طرف راجع ہیں۔ عجیب بات ہے کہ اخیر کے جملہ میں ضمیر خطاب کی مسلمانوں کی طرف ہو گئی۔ ذرا سی عربی جاننے والا اور نحو میر پڑھنے والا بھی ایسی بات نہیں کہہ سکتا حیرت کی بات ہے کہ جن کو صرف و نحو بھی نہیں آتی وہ علماء کا مقابلہ کرتے ہیں اور اجتہاد کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ہر آیت کا لغوی مفہوم دیکھا جاتا ہے اور سیاق و سباق دیکھا جاتا ہے اور شان نزول پر بھی نظر ڈالی جاتی ہے تب کوئی حکم ثابت کیا جاتا ہے لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ سے عموم اجتہاد

اس کی غرض بھی سمجھی ہو پھر مقدمہ کے غامض پہلوؤں کو سمجھتا ہو تب یہ
لیاقت ہوتی ہے کہ تجویز کرے کہ فلاں دفعہ میں یہ مقدمہ داخل ہے
اسی طرح یہاں بھی سمجھئے۔

پر استدلال کرنا ایسا ہے جیسے لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ سے نماز کی ممانعت ثابت کرنا بلکہ ایسا ہے جیسے کسی عیسائی نے اپنی کتاب پر یہ آیت لکھ دی تھی اَلْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰہِ جس کا مطلب یہ نکالا کہ نعوذ باللہ قرآن بھی حضرت عیسٰے علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتا ہے حالانکہ آیت یہ ہے:

وَقَالَتِ النَّصَارَی الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰہِ — یعنی نصاریٰ کا قول ہے کہ حضرت مسیح ابن اللہ ہیں۔

لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ میں خطاب کفار کو ہے۔ اس تمام سورت کا ترجمہ یہ ہے کہ کفار سے کہہ دو جس کی تم عبادت کرتے ہو میں اس کی عبادت نہیں کرتا اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور نہ میں اس کی عبادت کرنے والا ہوں جس کی تم نے اب تک عبادت کی اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں تمہارے واسطے تمہارا دین ہے اور میرے واسطے میرا دین"۔ مطلب یہ ہے کہ اے کفار ہم میں تم میں اختلاف کلی ہے تم اپنے مذہب پر ہو گے اور میں اپنے مذہب پر۔ جیسے تم اپنے مذہب سے نہیں ہٹ سکتے میں

اب یہ دوسری گفتگو ہے کہ آیا اب اس قوت و ملکہ کا شخص پایا جاتا ہے یا نہیں یہ ایک خاص گفتگو فیمابین فرقہ مقلدین وغیر مقلدین کے ہے جس میں اس وقت کلام کا طویل کرنا امر زائد ہے کیونکہ مقاصد ان غلطیوں کے بیان کا ہے جن میں جدید تعلیم والوں کو لغزش ہوئی ہے اس لئے اس باب میں صرف اس قدر عرض کرنا کافی ہے کہ اگر فرض کر لیا جائے کہ ایسا شخص اب بھی پایا جاتا ہے تب بھی سلامتی اسی میں معلوم ہوتی

بھی اپنے مذہب سے نہیں ہٹ سکتا۔ بعض وقت معاند سے اسی طرح پیچھا چھڑایا جاتا ہے۔ اس قسم کا مضمون قرآن میں بہت جگہ ہے۔ مثلاً فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَقُلْ آمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَابٍ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ۔

اس آیت سے ہمارا مقصود جملہ:۔

لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ہے یعنی ہم میں تم میں کچھ حجت نہیں۔

یہ معاند کے ٹالنے ہی کے لئے ہے ورنہ گفتگو کفار سے ہمیشہ رہی اور تبلیغ برابر جاری رہی بلکہ قتل و قتال کی نوبت آئی۔

ہے کہ اپنے اجتہاد و قیاس پر اعتماد نہ کرے کیونکہ ہمارے نفوس میں
غرض پرستی و بہانہ جوئی غالب ہے اگر اجتہاد سے کام لیا جائے گا
تو فریب یقینی امر ہے کہ ہمیشہ نفس کا میلان اسی طرف ہو گا جو اپنی
غرض کے موافق ہو اور پھر اس کو دیکھ کر دوسرے نااہل اس کا بہانہ ڈھونڈھ
کر خود بھی دعوئے اجتہاد کا کریں گے اور تقوےٰ اور تدین سب
مختل ہو جائے گا۔

دوسری جگہ مومنین کی شان میں فرمایا ہے:۔

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ	جب وہ بیہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے
اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا	بے رخی کرتے ہیں اور اُن لوگوں سے کہتے
لَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ	ہیں کہ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے
اَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ	تمہارے اعمال ہمارا اسلام لو ہم بے سمجھ لوگوں سے
لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِيْنَ	الجھنا نہیں چاہتےؔ۔ جاہلوں کو ڈھونڈھتے
	نہیں پھرتے۔

غرض یہ مضمون بہت جگہ ہے اور سورۂ قل یا ایھا الکافرون میں بھی
یہی مضمون ہے اور مخاطب اس کے کفار ہیں اجتہاد سے کوئی علاقہ
نہیں۔

ملہ اشارۃ الی تقدیر المضاف وھو المخاطبۃ والمنازلۃ کذا فی بیان القرآن۔

قولہ اب یہ دوسری گفتگو ہے الخ مطلب یہ ہے کہ قیاس حجت شرعی ضرور ہے جب کہ با قاعدہ اور مع شرائط ہو اور قیاس کرنے والا اس کا اہل ہو۔ اصل مسئلہ یہی ہے۔ رہا یہ کہ اس زمانہ میں وہ اہل موجود ہے یا نہیں یہ گفتگو اصل مسئلہ سے زائد ہے اور اہلِ اسلام کا ایک فرقہ جو اپنے آپ کو اہل حدیث کہتا ہے اور سلف کی تقلید نہیں کرتا وہ کہتا ہے کہ اب بھی اس کے اہل موجود ہیں اور معمولی علم والا بھی اجتہاد کر سکتا ہے اور دوسرا گروہ جو اہلِ تقلید کہلاتا ہے وہ کہتا ہے کہ اس زمانہ میں کوئی قیاس کا اہل موجود نہیں لہذا اب اجتہاد جائز نہیں۔ حضرت مصنف مدظلہ فرماتے ہیں کہ اس امر زائد کو یہاں چھیڑنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس کتاب کا موضوع ان اغلاط کو حل کرنا ہے جس میں جدید تعلیم یافتہ اصحاب مبتلا ہیں نہ کہ تقلید و عدم تقلید وغیرہ کے ابحاث (تقلید کے متعلق علماء نے مبسوط کتابیں لکھی ہیں۔ حضرت مدظلہ نے بھی ایک مختصر مگر جامع رسالہ مسمی الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد لکھا ہے جو قابلِ دید ہے) اور بحث اجتہاد کے متعلق یہاں حضرت مدظلہ نے صرف اس پر اکتفا کیا ہے کہ مان بھی لیا جائے کہ اب بھی اجتہاد کا اہل کوئی موجود ہے تب بھی سلامتی اسی میں ہے کہ اپنے اجتہاد و قیاس پر اعتماد نہ کیا جائے اور سلف کے اجتہاد کو ترجیح دی جائے کیوں کہ فی زمانہ غرض پرستی اور

ہائی کورٹ کے ججوں کے فیصلے کے سامنے کسی کو حتیٰ کہ حکام ماتحت کو بھی دفعہ قانونی کے دوسرے معنے سمجھنے کی اجازت محض اس بنا پر نہیں دی جاتی کہ ان کو سب سے زیادہ قانون کے معنے سمجھنے والا سمجھا گیا ہے اور ان کی مخالفت کی اجازت سے ہر شخص اپنے طور پر کارروائی کر کے ملک میں تشویش و بدنظمی کا سبب ہو جائے گا بس یہی سبب ہم کو مجتہدین کے ساتھ سمجھنا چاہیئے۔

حیلہ جوئی کی بلا، عام ہو گئی ہے عوام کا تو ذکر کیا علماؑ بھی اس سے خالی نہیں بات بات پر رسالہ بازی اور فتوے بازی ہوتی ہے ایک امر مستحب بلکہ مباح میں اختلاف ہوتا ہے تو گالی گلوچ کی نوبت آجاتی ہے اور کفر تک کا فتویٰ لگا دیا جاتا ہے۔ نہ ادب نہ رعایت حدود نہ خوفِ خدا۔ اور سلف کے حالات پڑھئے تو فرائض تک کے اختلاف میں بھی نہ ادب ہاتھ سے دیتے تھے نہ حدود سے تجاوز ہوتا تھا۔ نہ خوف خدا چھوڑتے تھے دیکھئے امام ابو حنیفہؒ اور شافعیؒ میں قرأت فاتحہ خلف الامام میں اتنا اختلاف ہے کہ ایک حرام کہتے ہیں اور ایک فرض لیکن ادب کی یہ حالت ہے کہ امام شافعیؒ نے امام ابو حنیفہؒ کا میلا کرتا دھو کر پیا تاکہ مجکو بھی علم نصیب ہو اور ابنِ حجر مکی نے رسالہ خیرات الحسان میں لکھا ہے کہ جب امام شافعیؒ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے مزار پر تشریف لائے ہیں تو صبح کی نماز میں دعائے قنوت

نہیں پڑھی اور یہی وجہ فرمائی کہ آپ کے قرب میں آپ کے خلاف کرتے ہوئے شرم آتی ہے اھ بحاصلہ۔ سچ یہ ہے کہ سلف کا اختلاف

إِخْتِلَافُ أُمَّتِي رَحْمَةٌ — میری امت کا اختلاف رحمت ہے (حدیث)

کا مصداق ہے اور آج کل کا اختلاف اس آیت کا مصداق ہے

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا	ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جنھوں نے
وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا	تفرق و اختلاف اختیار کیا بعد اس
جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَ	کے کہ ان کے پاس کھلی کھلی دلیلیں آ
أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ	چکیں ایسے لوگوں کے لئے بڑا
عَظِيمٌ ۝	عذاب ہے۔

یہ آیت علماء اور قائدین ملت ہی کے واسطے ہے جیسا کہ سیاق و سباق آیت میں صاف موجود ہے۔ جب آج کل علماء کا یہ حال ہے تو اجتہاد کی اجازت دینے کا نتیجہ سوا اس کے کیا ہے کہ طرح طرح کے فتنے پیدا ہوں اور ہر شخص کا نیا مذہب ہو اور ایسے علماء کو دیکھ کر نیم ملا ان سے بھی زیادہ مجتہدین بنیں اور دین بالکل نذر وہی ہوجائے بس سلامتی اگر ہے تو اسی میں ہے کہ مجتہدین سلف کا اتباع کیا جائے کیونکہ ان کے علم اور تدین و تقوے پر پورا اعتماد کیا جاسکتا ہے انہوں نے اگر آپس میں اختلاف بھی کیا تو نہ بوجہ نفسانیت بلکہ بوجہ خوف خدا کیا

جس میں وہ درصورت خاطی ہونے کے بھی ماجور ہیں تو ان کی تحقیق پر عمل کرنے میں تو کوئی خطرہ ہی نہیں اور اپنے اجتہاد پر عمل کرنے میں طرح طرح کے خطرات ہیں پھر کیا عقل کی بات ہے کہ بے خطر راہ کو چھوڑ کر پُرخطر راہ کو اختیار کیا جائے۔

نوٹ:- یہ یاد رہے کہ یہ گفتگو امورِ اجتہادیہ میں ہو رہی ہے یعنی ان باتوں میں جن کے متعلق قرآن و حدیث و اجماع میں کوئی تصریح نہیں ملی (قیاس کی اجازت ہی ایسے امور میں ہے) یہ یاددہانی اس واسطے کی گئی کہ بعض دریدہ دہن کہہ دیا کرتے ہیں کہ سلف کو ہم پیغمبر نہیں سمجھتے کہ جو وہ کہیں بے چون و چرا اور بے سوچے سمجھے مان لیں حتیٰ کہ بعض لوگ اس آیت کو پیش کرنے لگتے ہیں:۔

اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ — یعنی بنا لیا ہے انہوں نے اپنے
وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ — علماء اور درویشوں کو اور مسیح
دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ — ابن مریم کو اپنا خدا حق تعالیٰ
مَرْيَمَ — کو چھوڑ کر۔

یہ آیت اہلِ کتاب کے بارہ میں ہے مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ حق تعالیٰ کے حکم کو اتنا نہیں سمجھتے جتنا اپنے مقتداؤں کے حکم کو سمجھتے ہیں۔ تقلید مجتہدین کو اسی میں داخل کیا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ لوگ

حاصل اغلاط متعلقہ اصول اربعہ کا یہ ہے کہ قرآن کو حجت بھی مانا اور ثابت بھی مانا مگر اس کی دلالت میں غلطی کی۔ اور حدیث کو حجت تو مانا مگر ثبوت میں کلام کیا اس لئے دلالت سے بحث ہی نہیں کی۔ اور اجماع کو حجت ہی نہیں مانا۔ اور قیاس کی جگہ ایک اور چیز مخترع کر کے اس کو اصل معیار ثبوت احکام کا قرار دیا اور مخترع چیز رائے ہے۔

میں بہت فرق ہے اہل کتاب کے علماء دین میں تحریف کرتے تھے اور اسی کو سب مانتے تھے حتیٰ کہ ابنیت مسیح کے قائل ہوئے اور ہم تقلید سلف کی صرف اُن امور میں ضروری کہتے ہیں جن میں حدیث و قرآن میں تصریح نہیں ملتی اور ان میں بھی ان کی تقلید اسی حیثیت سے کرتے ہیں کہ وہ حدیث و قرآن سے حکم نکالتے ہیں جس کا اذن خود حدیث و قرآن میں موجود ہے جیسا کہ اوپر شرح بیان ہو چکا ہے تو یہ اس آیت کے تحت میں کیسے آ سکتا ہے۔ موٹی بات ہے کہ جب قرآن و حدیث میں کوئی حکم مصرح نہیں ہے تو عمل تو کسی طرح کیا ہی جائے گا اور اس کا استنباط قرآن و حدیث ہی سے کرنا ہوگا یہ کام ائمہ سلف نے کر کے فقہ کو مرتب کر دیا ہے اگر ائمہ سلف کا استنباط صحیح نہ سمجھا جائے تو اپنا استنباط صحیح سمجھا جائے گا۔ پھر جو نسبت ہمارے

علم و عمل کو سلف کے علم و عمل سے ہے وہی نسبت دونوں استنباطوں میں ہو گی اسی کے لئے اوپر عرض کیا گیا ہے کہ آج کل کے بڑے سے بڑے عالم کے سامنے سو مسئلے رکھ دیئے جائیں اور ان کا استخراج حدیث و قرآن سے کرایا جائے اور کتب فقہ سے بالکل مدد نہ لی جائے پھر فقہ کی تحقیق کو اور ان کی تحقیق کو ملایا جائے ہماری تصدیق ہو جائے گی۔

یہاں بحث چاروں اصول شرع یعنی قرآن اور حدیث اور اجماع اور قیاس کی ختم ہوتی ہے اب مصنف مدظلہ چاروں کے متعلق غلطیوں کا خلاصہ بیان فرماتے ہیں۔ وہ یہ کہ قرآن کو تو حجت بھی مانا کیونکہ کلام الٰہی ہے کون ایسا شخص ہے جس کے ساتھ مسلمان ہونے کا نام لگا ہو اور وہ کلام الٰہی کو قابلِ احتجاج نہ سمجھے۔ اور ثابت بھی مانا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم تک بلا تحریف و تغیر و تبدل پہنچا ہے حتیٰ کہ متعصب سے متعصب عیسائیوں کو بھی ماننا پڑا ہے کہ قرآن میں تحریف نہیں ہوئی ہاں ابنار زمان نے قرآن کی دلالت میں غلطی کی ہے۔ یعنی آیتوں کے معانی اور مطالب کو کھینچ تان کر اپنے مطلب کے موافق بنایا ہے جیسے ابھی لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ کے متعلق بیان ہوا ہے کہ اس آیت سے ہر شخص کے لئے اجتہاد کی اجازت ثابت کی جاتی ہے حالانکہ اس کے مخاطب کفار ہیں اس آیت میں کفار معاندین سے اعراض کا حکم ہے اور قرآن کو مسائل سائنس پر مشتمل اور ان کے مطابق

ہونا ثابت کیا جاتا ہے اس کا بیان مکمل و مدلل اشتباہ چہارم متعلق قرآن میں گزر چکا ۔

اور حدیث کے متعلق یہ غلطی کی کہ اس کو حجت تو مانا اس وجہ سے کہ حدیث کی حقیقت کلام رسول ہے پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اسلام کا نام لیا جائے اور رسول کے حکم کو حجت نہ مانا جائے لیکن حدیث میں بہ نسبت قرآن کے احکام کی تفصیل ہے ان سے بچنے کا کوئی حیلہ نہیں رہا سوا اس کے کہ ان کو کلام رسول ماننے میں کلام کیا جائے ۔ لہذا کہدیا کہ موجودہ احادیث کے ثابت عن الرسول ہونے کی کیا دلیل ہے چنانچہ صاف کہتے ہیں کہ حدیثیں تو زمانۂ رسالت سے تین سو برس کے بعد بنائی گئی ہیں ۔ ان کا کیا اعتبار ہوسکتا ہے جب حدیث ثابت عن الرسول ہی نہ رہی تو اس کی دلالت میں کلام کرنے کی یعنی معانی میں کھینچ تان اور تحریف کی ضرورت کیا رہی ۔ اس کی تردید مفصل اشتباہ پنجم متعلق حدیث میں گزر چکی ۔

اور اجماع کو حجت ہی نہیں مانا پھر اس کے متعلق ثبوت میں کلام کرنے یا اہل اجماع کے کلام کے معانی میں کھینچ تان کی نوبت کیوں آئے گی ۔ اس کی تردید اور مفصل گفتگو اشتباہ ششم متعلق اجماع میں گزری

اور قیاس کے متعلق یہ غلطی کی کہ اس کا صحیح مفہوم ہی نہیں سمجھا نہ شرائط کا لحاظ کیا نہ اہل و نااہل میں امتیاز کیا نہ موقع و محل کی قید رکھی بس اس کو اپنے

عرفی معنے یعنی خیال و گمان ہی سمجھ کر خوب آزادی سے دین میں کام لیا جس سے وہ بجائے اصلی چیز کے ایک دوسری چیز بن گئی جس کو رائے اور ہوا کہتے ہیں جو نقلاً و عقلاً ہر طرح مذموم و ناجائز ہے [۱۵]

---

[۱۵] جس کا مفصل بیان اشتباہ ہفتم میں گزرا۔ ۱۲

انتباہ ہشتم

متعلق حقیقت ملائکہ وجن و ابلیس

ملائکہ اور جن کا وجود جس طرح کا نصوص و اجماع سے ثابت ہے اس کا انکار محض کبھی اس بنا پر کیا جاتا ہے کہ اگر وہ جواہر موجود ہوتے تو محسوس ہوتے اور کبھی اس بنا پر کہ اس طرح کا کسی شے کا ہونا کہ سامنے سے گزر جائے اور محسوس نہ ہو سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ تو وجہ انکار کی ہوئی پھر چونکہ آیات قرآنیہ میں بھی جا بجا ان کے وجود کا اثبات کیا گیا ہے اور قرآن کے ثبوت میں کلام نہیں ہو سکتا تھا اس لئے ان آیات میں ایسی بعید بعید تاویلیں کی جاتی ہیں کہ بالکل وہ حد تحریف میں داخل ہیں۔

شریعت نے صاف صاف الفاظ سے تصریح کی ہے کہ ملائکہ اور جن ایک قسم کی مخلوق ہیں اور وہ ذی روح ہیں اور عقل فہم رکھتے ہیں ان کے اجسام بنسبت انسان کے لطیف ہیں۔

انسانوں کو دیکھتے ہیں اور انسان ان کو نہیں دیکھتے مگر جب وُہ
چاہیں تو کسی صورت میں متشکل ہو کر انسانوں کو نظر آجاتے ہیں اور انسان
کی طرح اعمال کرتے ہیں اور مکلف ہیں اتنا فرق ہے کہ فرشتے انبیا علیہم السلام
کی طرح گناہ سے معصوم ہیں اور جن معصوم نہیں بلکہ ان کی طبیعت میں عصیان
غالب ہے۔ ملائکہ اور جن کے وجود کا یقین کرنا جزو ایمان ہے۔ یہ تصریحات
قرآن و حدیث میں اس کثرت سے موجود ہیں کہ ایک اردو خواں بھی ترجمہ
سے معلوم کر سکتا ہے اور وہ تصریحات ایسی صاف ہیں کہ ان میں کوئی تاویل
کرنا کھلی ہوئی تحریف ہے بعض تصریحات کو ہم بھی یہاں بیان کئے دیتے
ہیں۔ قال تعالیٰ :-

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ	تمام تعریف اس اللہ کے واسطے ہے
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ	جو پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا
الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا اُولِیْٓ	کا بنانے والا ہے فرشتوں کو پیغام رساں
اَجْنِحَۃٍ مَّثْنٰی وَثُلٰثَ	کہ وہ فرشتے دو دو بازو (پر) والے ہیں اور
وَرُبٰعَ	اور تین تین پر والے اور چار چار پر والے ہیں

اس آیت سے ثابت ہوا کہ فرشتے حق تعالیٰ کی پیدا کردہ مخلوق ہیں کیونکہ
سموات والارض ترکیب نحوی میں مفعول ہے فاطر کا (فاطر یعنے پیدا کرنے والا)
اور ظاہر ہے کہ سموات والارض سے مراد صرف جرم آسمان و زمین نہیں ہے

بلکہ مع تمام ان چیزوں کے جو اُن کے اندر ہیں اور ملائکہ بھی ان کے اندر
ہیں تو وہ بھی ترکیب میں فاطر کے مفعول ہوئے۔ نیز حق تعالیٰ نے خدمت
پیغام رسانی کی ان کے سپرد کی ہے تو وہ خادم اور بندے ہوئے دوسری جگہ
صاف فرمایا:

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۔	بلکہ وہ معزز بندے ہیں

نیز آیت مذکورہ سے ثابت ہوا کہ فرشتے پیدا و مخلوق ہیں اس سے تردید ہوتی ہے
بعض اہل باطل کے قول کی کہ فرشتے قوائے الٰہی ہیں کیونکہ قویٰ کے پیدا ہونے
کے کیا معنے وقال تعالیٰ:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ	اور جبکہ فرمایا تیرے رب نے فرشتوں سے
اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ	کہ میں بناؤں گا زمین میں ایک خلیفہ
خَلِیْفَةً قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ	کہا فرشتوں نے کہ کیا آپ ایسے شخص
فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ	کو خلیفہ بنائیں گے جو زمین میں فساد
الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ	کرے گا اور خونریزی کرے گا اور ہم
بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ	آپ کی تسبیح اور حمد اور تقدیس کرتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ خلیفہ بنائے جانے کے ہم زیادہ مستحق ہیں یہ گفتگو حق تعالیٰ کی اور
فرشتوں کی طویل ہے یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے قولاً و فعلاً جواب دے کر
فرشتوں کو ساکت کیا اور ان کو ماننا پڑا کہ آدم ہی خلیفہ بنائے جانے کے

مستحق ہیں اس سے معلوم ہوا کہ فرشتوں میں قوت نطق اور عقل و فہم ہے
قواسے الہیہ سے حق تعالے کی مکالمت اور جواب و سوال اور ان کو لاجواب
کرنے کے کیا معنے وقال تعالیٰ فی قصۃ مریم علیہا السلام:

فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا۔

یعنی مریم علیہا السلام جب خلوت خانہ میں پردہ میں جا بیٹھیں۔ تو ہم نے ان کے پاس اپنی روح الروح الامین حضرت جبریل) کو بھیجا تو وہ حضرت مریم کے سامنے بشکل ایک تندرست انسان کے ظاہر ہوئے

اس سے فرشتہ کا بشکل انسان متشکل ہونا ثابت ہوا وقال تعالے:

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ فَلَمَّا تَرَاءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ۔

یہ آیت جنگ بدر کے بارہ میں ہے ترجمہ یہ ہے کہ شیطان نے کفار قریش کی نظروں میں ان کے اعمال کو اچھا کر دکھایا اور کہا ضرور جنگ کرو آج کے دن کوئی بھی تم پر غالب نہیں آسکتا اور میں بھی تمہارے ساتھ ہوں" پھر جب دونوں لشکر مقابل ہوئے تو شیطان الٹے پیروں لوٹ پڑا اور کہا میں تم سے علیحدہ ہوں مجھے وہ چیزیں دکھائی دیتی ہیں جو تمہیں نہیں دکھائی

دیتیں (یہ فرشتے تھے جو مسلمانوں کی مدد کے لئے نازل ہوئے تھے) اس آیت سے شیطان کا بشکل انسان متمثل ہونا ثابت ہوا جس نے کفار سے بات چیت کی نیز ملائکہ کا جنگ میں موجود ہونا مگر کفار کو نظر نہ آنا ثابت ہوا۔

وقال تعالےٰ: یَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي وَيُنْذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا۔

اس آیت میں قیامت کے واقعہ کا بیان ہے کہ کفار جن و انس سے کہا جائے گا کہ کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے رسول نہیں آئے تھے جو میری آیتوں کو تمہارے سامنے بیان کرتے تھے اور تم کو اس دن سے ڈراتے تھے۔ الی آخر الآیہ۔ عذاب و ثواب اعمال ہی پہ ہو سکتا ہے ثابت ہوا کہ جن بھی مکلف بالاعمال ہیں۔ اور پچھلے زمانہ میں جنوں کے لئے ایک قول پہ رسول بھی ان ہی میں سے ہوتے تھے اب ان کے رسول بھی ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں کیونکہ حضور خاتم النبیین ہیں۔ اور حضور کی بعثت عام ہے۔ تمام جہاں کے لئے بدلیل:

تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ	بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس نے قرآن کو
الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ	اتارا اپنے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تاکہ ہو

لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا ۝	وہ تمام جہانوں کے لئے ڈرانے والے۔

نیز سورۂ احقاف میں جنات کا واقعہ نقل کیا گیا ہے:

وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفَرًا	یاد کرو اس کو کہ ہم نے ایک جماعت
مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ	جن کی تمہاری طرف متوجہ کر دی کہ وہ
فَلَمَّا حَضَرُوهُ قَالُوا أَنصِتُوا	سننے لگی قرآن کو۔ وہ جب وہاں حاضر
فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَىٰ قَوْمِهِم	ہوئے تو بولے چپ رہو۔ پھر جب تلاوت
مُّنذِرِينَ قَالُوا يَا قَوْمَنَا	قرآن ختم ہوئی تو اپنی قوم کی طرف لوٹے
إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا أُنزِلَ	ڈر کی بات سناتے ہوئے بولے اے
مِن بَعْدِ مُوسَىٰ مُصَدِّقًا	قوم ہماری ہم نے سنی ایک کتاب جو اتری
لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِي إِلَى	ہے موسیٰ کے بعد سچا کہنے والی سب
الْحَقِّ وَإِلَىٰ طَرِيقٍ مُّسْتَقِيمٍ	اگلی کتابوں کو رہبری کرتی ہے حق
يَا قَوْمَنَا أَجِيبُوا دَاعِيَ	کی طرف اور سیدھے راستہ کی طرف
اللَّهِ وَآمِنُوا بِهِ يَغْفِرْ لَكُم	اے قوم ہماری کہنا مانو اللہ کے بلانے
مِّن ذُنُوبِكُمْ وَيُجِرْكُم مِّنْ	والے کا اور اس پر ایمان لاؤ کہ بخشے تم کو
عَذَابٍ أَلِيمٍ وَمَن	تمہارے گناہ اور بچائے تم کو دردناک
لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللَّهِ فَلَيْسَ	عذاب سے۔ اور جو کوئی کہنا نہ مانے گا
بِمُعْجِزٍ فِي الْأَرْضِ وَلَيْسَ	اللہ کے بلانے والے کا تو وہ نہیں

لَهٗ مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءُ — ہے قبضہ سے نکل جانے والا اور نہ اس کا
اُوْلٰٓئِکَ فِیْ ضَلٰلٍ — کہیں زمین میں اور کوئی نہیں ہے اس کا
مُّبِیْنٍ ط — اس کے سوا مددگار یہ لوگ صریح گمراہی میں ہیں۔

اس سے جنات کا وجود نیز اُن کا مکلف ہونا ثابت ہوا نیز سورۂ جن میں اسی قسم کا مضمون موجود ہے: فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِکَ تَحَرَّوْا رَشَدًا وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَکَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا جنات کہتے ہیں کہ جو کوئی ہم میں سے اسلام لے آیا تو اس نے اپنے واسطے ہدایت کا راستہ تجویز کر لیا اور رہے وہ جو بے انصاف ہیں تو وہ دوزخ کے ایندھن ہوں گے وقال تعالیٰ:

لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ

یہ آیت فرشتوں کے بارہ میں ہے۔ یعنی فرشتے حق تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم ہوتا ہے۔ اس سے فرشتوں کا معصوم ہونا ثابت ہوا۔ وقال تعالیٰ:۔ کَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّہٖ۔ یہ آیت ابلیس کے بارہ میں ہے یعنی ابلیس قوم جن میں سے تھا لہذا اس نے اپنے پروردگار کے حکم کے خلاف کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ جن کی طبیعت میں نافرمانی کا مادہ غالب ہے وقال تعالیٰ

کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ — یعنی سب ایمان والے لائے اللہ پر
وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ — اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔

ثابت ہوا کہ فرشتوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ وقال تعالیٰ:۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ — یعنی جو کوئی دشمن ہو اللہ کا اور اس کے فرشتوں

وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ — کا اور اس کے رسولوں کا اور جبریل ومیکائیل

فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ — کا تو اللہ بھی دشمن ہے کافروں کا۔

اس سے معلوم ہوا کہ فرشتوں کی مخالفت حق تعالیٰ کی مخالفت ہے۔

یہ تو قرآنی تصریحات ہیں اور احادیث میں بھی ملئکہ اور جن کے متعلق اس قدر تصریحات موجود ہیں کہ ان کا انکار یا تاویل سوائے تحریف کے کچھ نہیں۔ حدیث جبریل مشہور حدیث ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص دربار نبوی میں حاضر ہوا جس کو کوئی پہچانتا نہ تھا اور اس پر سفر کے آثار بھی نہ تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے چند دین کی باتیں پوچھیں جب وہ چلا گیا تو حضور نے فرمایا اس کو بلا لاؤ اس کے پیچھے آدمی گیا لیکن اس کا پتہ نہ چلا فرمایا یہ جبریل علیہ السلام تھے جو اس طرح سے تم کو دین کی باتیں بتانے آئے تھے اور میں ان کو ہمیشہ پہچان لیتا تھا مگر آج نہیں پہچانا تمام زمانہ رسالت میں جبریل علیہ السلام کا آنا جانا پردہ تصویر دیکھ کر لوٹ جانا ہر سال رمضان کے قریب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرآن کا دور کرنا وغیرہ وغیرہ ہزارہا واقعات ہیں جو علماء کی بلکہ طلبہ کی زبانوں پر جاری وساری ہیں اور اردو کی کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ احادیث سے تو

یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں تمام اچھے کام فرشتے کے اثر سے اور برے اور نکمے کام شیطان کے اثر سے ہوتے ہیں چنانچہ وارد ہے کہ ہر انسان کے ساتھ ایک فرشتہ ہوتا ہے جو اچھی باتیں سمجھاتا ہے اس کو لمۃ الخیر کہتے ہیں اور ایک شیطان ہوتا ہے جو بری باتیں سمجھاتا ہے اس کو لمۃ الشر کہتے ہیں اور حدیث میں آیا ہے کہ جب مرغ بولے تو تم بھی تسبیح کہو کیونکہ وہ فرشتہ کو دیکھ کر بولا ہے اور جب گدھا بولے تو اعوذ باللہ پڑھو کیوں کہ وہ شیطان کو دیکھ کر بولا ہے۔ اور آیا ہے کہ جب پاخانہ میں جاؤ تو یہ پڑھ لو۔

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الْخُبُثِ — یعنی اللہ کی پناہ مانگتا ہوں میں خبیث جن مرد

وَالْخَبَائِثِ — اور خبیث جن عورتوں سے۔

اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ جن چلتے پھرتے رہتے ہیں اگر ننگے انسان کو دیکھتے ہیں تو اس کی مقعد سے کھیلتے ہیں یہ دعا پڑھنے سے یا بسم اللہ کہہ لینے سے درمیان میں آڑ ہو جاتی ہے چنانچہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

سَتْرُ مَا بَیْنَ اَعْیُنِ الْجِنِّ — یعنی جن کی آنکھوں اور بنی آدم کے

وَعَوْرَاتِ بَنِیْ اٰدَمَ اِذَا دَخَلَ — مستور اعضا کے درمیان میں آڑ

اَحَدُکُمُ الْخَلَاءَ اَنْ یَّقُوْلَ — یہ ہے کہ جب تم پاخانہ میں جاؤ تو

بِسْمِ اللّٰہِ — بسم اللہ لکھ لو

اس سے ثابت ہوا کہ جن انسانوں کی آبادی میں اس کثرت سے موجود ہیں کہ ہر جگہ ان سے بچنے کی ضرورت ہے قرآن شریف میں صاف موجود ہے:

وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ — یعنی حق تعالیٰ نے ابلیس سے فرمایا جبکہ ابلیس کہتا تھا کہ مجھے قیامت تک کی عمر مل جاوے تو تمام بنی آدم کو گمراہ کر دونگا کہ جا بنی آدم کے اموال اور اولاد میں اپنا ساجھا کر لینا

مطلب یہ ہے کہ مال و اولاد کو ذریعہ گمراہی بنا دینا غرض جس طرح تیرا قابو چلے ان کو بہکانا جس کو ہم چاہیں گے اس پر تیرا قابو کچھ نہ چلے گا) اس سے ثابت ہوا کہ شیاطین بنی آدم کے کاروبار اور مال بچوں تک میں خاص تصرف کے ساتھ شامل رہتے ہیں۔ اور اسلامی عقیدہ ہے کہ ہر انسان کے ساتھ ایک فرشتہ نیکی کا لکھنے والا اور ایک فرشتہ بدی کا لکھنے والا ہر وقت رہتا ہے اس کا ثبوت اس آیت سے ہے

وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ كِرَامًا كَاتِبِينَ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ — یعنی تمہارے اوپر نگراں تعینات ہیں جو حق تعالیٰ کے نزدیک معزز ہیں وہ لکھتے ہیں اور جو کچھ تم کرتے ہو جانتے ہیں:

ظاہر ہے کہ جتنے انسان ہیں ان سے دو چند یہ فرشتے ہوئے ایک آیت یہ ہے:-

لَهٗ مُعَقِّبَاتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ

یعنی انسان کیلئے بہت سے فرشتے ہیں جو نوبت بنوبت آتے ہیں کہ آگے اور پیچھے سے اس کی حفاظت کرتے ہیں خدا تعالےٰ کے حکم سے۔

اور حدیث میں ہے کہ ایک جماعت فرشتوں کی صبح کی نماز کی جماعت میں آتی ہے اور ایک جماعت عصر کی نماز کی جماعت میں اور یہ دونوں جماعتیں فجر اور عصر میں جمع ہو جاتی ہیں پھر وہ جا کر نمازوں کو دربار الٰہی میں پیش کرتی ہیں۔ دنیا میں کتنی جگہ جماعت ہوتی ہے تو یہ فرشتے کس قدر ہوں گے۔ علماء کی تحقیق ہے کہ سب سے زیادہ تعداد میں مخلوق فرشتے ہی ہیں۔ غرض بکثرت آیات و احادیث موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ فرشتے اور جن دنیا میں بکثرت موجود ہیں۔

ان تصریحات کو پڑھ کر ناظرین بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان سے وہ تمام باتیں کس صراحت سے ثابت ہوتی ہیں جن کے ثبوت میں ہم نے ان کو پیش کیا ہے یعنی فرشتوں اور جن کا وجود۔ اور اُن کا ذی روح ذی عقل ہونا۔ اور ان کا انسانوں کو دیکھنا اور انسانوں کا ان کو نہ دیکھنا۔ اور ان کا مختلف صورتوں میں متشکل ہونا۔ اور ان کا مکلف بالاعمال ہونا اور فرشتوں کا معصوم ہونا ان کے وجود کے عقیدہ کا جزو ایمان ہونا اور یہ بھی اندازہ کر سکتے ہیں کہ کیا ان تمام آیات و احادیث کے عنوانات و الفاظ ایسے ہیں جن میں کسی تاویل کی گنجائش ہو۔ حاشا و کلا۔ ہم اس کو طول

جن بناؤں پر ظاہری معنے کا انکار کیا گیا ہے ان کا غلط ہونا تو اصول موضوعہ
نمبر ۴ میں ثابت ہو چکا ہے یہ تو تحقیقی جواب ہے

نہیں دیتے بلکہ ناظرین کے انصاف پر چھوڑتے ہیں۔ عیاں راچہ بیاں یہ تو فرشتوں اور جن کا ثبوت قرآن و حدیث سے ہوا اور ملائکہ اور جن کے وجود پر امت کا اجماع بھی ہے کسی نے ان کے وجود کا مع ان صفات مذکورہ کے کسی زمانہ میں انکار نہیں کیا بلکہ ان کا ثبوت جیسا کہ قرآن پاک میں ہے ایسا ہی تمام کتب سماویہ میں موجود ہے تو ان کا انکار تمام ادیان سماویہ کے خلاف ہوا آج کل ایک بلاء عام پھیل گئی ہے کہ تعلیم یافتہ اصحاب کی طبیعتوں میں ملائکہ اور جن کی طرف سے اس قدر استبعاد بڑھ گیا ہے کہ ان کے وجود کا انکار ہی کر بیٹھتے ہیں اور انکار کی بنا محض اتنی سی بات پر ہے کہ اگر ان کا وجود ہوتا تو محسوس ہوتا یا یوں کہا جاتا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک چیز ہمارے سامنے سے گزر جائے اور محسوس نہ ہو یہ اشکال انکے ذہنوں میں ایسا لاینحل ہے کہ قطعی دلائل بھی اسکے مقابلہ میں غیر قابل تسلیم ہیں حتی کہ شرعی تصریحات صاف صاف دیکھ کر ان کو یہ آسان معلوم ہوتا ہے کہ ان میں الٹی سیدھی تاویل کر کے دل کو سمجھا لیں مگر اس اشکال کو کسی تاویل سے حل کرنا دشوار ہے۔ حضرت مصنف مدظلہ نے اس اشکال کو الزاماً و تحقیقاً حل کیا ہے تحقیقاً اس طرح کہ خلاصہ اشکال کا یہ ہے کہ کسی چیز کا وجود بلا مشاہدہ کیسے تسلیم کر لیا جائے اس کا غلط ہونا اصول موضوعہ نمبر ۴ میں ثابت کیا جا چکا ہے تقریر اس کی مختصر یہ ہے کہ کسی چیز کے وجود کا قائل ہونا تین طرح پر ہوتا ہے ایک مشاہدہ سے

جس کو آج کل محسوس ہونا بھی کہتے ہیں جیسے ایک چیز آنکھ سے دیکھ لی - دوسرے سچی خبر
سے جیسے کسی نے خبر دی کہ آج عدالت سے فلاں شخص کو سزا ہو گئی یہ اس کو سن کر
سچا مان لیا جاتا ہے دنیا کے اکثر کام خبر صادق ہی پر مبنی ہیں اخباروں کو پڑھ کر دور
دراز ممالک کے حالات پر یقین کیا جاتا ہے گورنمنٹ گزٹ پڑھ کر خطابات عطا
ہونے پر قوانین کے نفاذ پر امتحانوں کے نتائج پر بارش کی مقدار پر اور غلہ کے
نرخوں پر یقین کیا جاتا ہے یہ سب خبر صادق ہی کے افراد تو ہیں تیسرے استدلال
عقلی سے جیسے دھوپ کو دیکھ کر آفتاب کے نکلنے کا یقین کر لینا - ان اخیر کی دو
صورتوں میں مشاہدہ شرط نہیں مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ میری آمد فی ایک لاکھ روپیہ
روز ہے تو ہم اگر اس خبر کا یقین کریں گے تو اس کے ساتھ ہی ہم کو یہ بھی یقین ہو جائے
گا کہ تیس دن میں تیس لاکھ روپیہ اس کے پاس آتا ہے حالانکہ ہم نے اپنی آنکھ سے
کبھی ایک لاکھ روپیہ بھی نہیں دیکھا یا ہم نے سنا کہ شاہ جارج پنجم کا انتقال ہو گیا
اور بجائے ان کے ایڈورڈ ہشتم جانشین ہوئے تو نہ ہم نے جارج پنجم کو انتقال
کرتے دیکھا نہ ایڈورڈ ہشتم کو جانشین ہوتے ہوئے دیکھا مگر یقین ایسا ہے کہ
کسی شبہ کی بھی گنجائش نہیں اخیر کی دونوں صورتوں میں مشاہدہ نہیں ہے مگر علم
یقینی موجود ہے اس سے ثابت ہوا کہ کسی بات کے ثبوت کے لئے مشاہدہ
شرط کلی نہیں اور یہ خیال غلط ہے کہ جس چیز کا مشاہدہ نہ ہوا اس کے وجود کو تسلیم نہ کیا جائے
پھر اگر شریعت ملائکہ اور جن کے وجود کی خبر دیتی ہے تو ان کے ثبوت کے

اور الزامی جواب یہ ہے کہ مادہ کے لئے قبل تلبس صور موجودہ جس قوام لطیف

نہیں پہنتے ۱۲

کو تم مانتے ہو جس کو مادہ سدیمیہ اور اثیریہ کہتے ہیں وہ جوہر ہے اور کبھی تم نے

اس کا مشاہدہ نہیں کیا اور نیز اس کی کیفیت بجز تخیل مبہم کے شافی طور پہ سمجھ میں

بھی نہیں آتی چنانچہ بہتا نیین اس کے منکر بھی ہیں۔

کے مشاہدہ کا مطالبہ کیوں کیا جاتا ہے۔ یہ تو جواب تحقیقی ہوا اور جواب الزامی یہ ہے

کہ جدید سائنس دانوں نے تسلیم کیا ہے کہ دنیا کی ہر چیز مادہ اور صورت سے بنی

ہے اور ان کے نزدیک مادہ ایک وقت میں ایک قوام دار لطیف جوہر تھا اس میں

مختلف صورتیں شامل ہو کر دنیا کی چیزیں بن گئیں اس قوام کو مادہ سدیمیہ اور اثیریہ

کہتے ہیں اس کی مثال یہ ہے کہ کاغذ بنانے کے لئے اول ایک مادہ گھی کی شکل کا تیار

کیا جاتا ہے پھر اس کو مختلف وزنوں اور صورتوں پر جما لیا جاتا ہے تو طرح طرح کے

کاغذ تیار ہو جاتے ہیں۔ اور سائنس دان مانتے ہیں کہ وہ قوام از جنس جوہر ہے

یعنی قائم بالذات چیز ہے اور اپنے وجود میں دوسری چیز کا محتاج نہیں اور ایسا

نہیں ہے جیسے رنگ ہوتا ہے کہ اس کا مستقل کوئی وجود نہیں بلکہ اپنے وجود

میں دوسری چیز کا محتاج ہے کیونکہ رنگ ہمیشہ کسی چیز میں ہو کر پایا جاتا ہے۔

ایسی غیر مستقل چیز کو عرض کہتے ہیں۔ غرض وہ قوام جوہر ہے اس کے جوہر ہونے کی

دلیل یہ ہے کہ اس مادہ کا وجود دنیا کی جملہ چیزوں سے مقدم مانا گیا ہے کیونکہ دنیا

اسی سے بنی ہے پس اگر اس کو عرض مانا جائے تو اس کا وجود کسی دوسری چیز

کے اندر ہو کر ماننا پڑے گا وہ چیز بھی دنیا کی کوئی چیز ہی ہوگی تو وہ مادہ پر مقدم ہوگی اور یہ خلاف مفروض ہے۔ غرض اس مادہ کے وجود کو سائنس داں بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں حالانکہ اس کو دیکھا کسی نے بھی نہیں اس کا وجود صرف اس خیالی ضرورت سے مان لیا ہے کہ ہم دنیا میں کسی چیز کا وجود بلا اس کے کہ پہلے اس کا مادہ تیار ہو نہیں دیکھتے اس سے خیال ہوتا ہے کہ تمام دنیا کا وجود بھی اسی طرح ہوا ہوگا کہ پہلے ایک مادہ ہو پھر اس میں مختلف صورتیں پیدا ہو گئی ہوں (اس وقت ہمیں اس سے تعرض کرنا نہیں ہے کہ یہ دلیل فی نفسہٖ صحیح ہے یا غلط اور اس کے اجزا (صغریٰ و کبریٰ) میں نتیجہ صحیح برآمد ہونے کے شرائط موجود ہیں یا نہیں، حدوث مادہ کی بحث بہت کافی افادہ اول میں گزر چکی۔ کہنا صرف یہ ہے کہ اس دلیل سے سائنس والوں نے اس پر یقین کر لیا ہے کہ دنیا کے وجود سے پہلے مادہ اثیریہ موجود تھا حالانکہ مشاہدہ نہیں کیا پس اگر وجود کے تسلیم کرنے کیلئے مشاہدہ شرط ہے تو اس مادہ کا وجود بلا مشاہدہ کیسے تسلیم کیا۔ فما ھو جوابکم فھو جوابنا۔ بات یہی ہے کہ یہ ثبوت مذکورہ بالا طرق ثبوت میں سے تیسری قسم میں داخل ہے جس کو استدلال عقلی کہا گیا ہے لطف یہ ہے کہ یہ آج کل کے سائنس دانوں کا استدلال درحقیقت استدلال عقلی کہے جانے کے قابل ہی نہیں کیونکہ استدلال کے اجزا میں شرائط استدلال کے نہیں پائے جاتے اس کی حقیقت قیاس الغائب علی الشاہد سے زیادہ نہیں یعنی یہی موجودہ اشیاء میں یہ دیکھ کر کہ اول مادہ تیار کیا جاتا ہے پھر اس کو مختلف صورتوں میں ڈھال لیا جاتا ہے حق تعالیٰ کی مصنوعات میں بھی

یہی کہہ دیا اور یقین کرلیا کہ اول مادہ تیار تھا پھر مختلف چیزیں بن گئیں اس تحقیق کا
مرتبہ وہم اور تخیل سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا اس سے آج کل ہی کے سائنس دانوں
کو تسلی ہوسکتی ہے کیونکہ وہ علمی تحقیقات میں ظن و وہم کو تسلیم کر لینے کے عادی ہیں
ان کے ہی بھائی پرانے سائنس داں ایسی تحقیقات کے عادی تھے اور ان سے
ان کی نظر کسی قدر عمیق تھی اس واسطے انہوں نے اس مادہ اثیریہ کا انکار کیا ہے تاہم فکر
ہر کس بقدر ہمت اوست یہ استدلال ان کی لیاقت کے موافق استدلال عقلی ہی ہے اور
ہمارے لئے جواب الزامی دینے کو کافی ہے۔ اور اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ
کسی چیز کے وجود کو تسلیم کرنے کے لئے مشاہدہ کی شرط لگانا سراسر غلطی ہے بلکہ
اس کے لئے استدلال عقلی بھی کافی ہے اور خبر صادق کا حجت ہونا بھی ثابت
ہے جیسا کہ ہم ابھی بیان کر آئے ہیں۔ تو جبکہ ملائکہ اور جن کے وجود کے لئے
خبر صادق یعنی آیات و احادیث صریح موجود ہیں تو اس میں شک و شبہ اور
قیل و قال کرنا مسلمان کو بحالت دعوے اسلام کرنے کے کیسے درست ہوگا کیوں کہ
دعوے اسلام کرتے ہی حدیث و قرآن کا صدق تسلیم کیا جاچکا ہے ہاں اگر کوئی غیر مسلم
شک و شبہ کرے تو اس کو گنجائش ہوسکتی ہے اس صورت میں اول اس کو دلیل سے
اسلام کا اور قرآن و حدیث کا صدق تسلیم کرایا جائے گا بعد ازاں مسئلہ زیر بحث کو پیش
کیا جائے گا اس وقت اس کو بھی کوئی گنجائش قیل و قال کی نہ ہوگی غرض یہ
کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے کہ مسلمانی کا دعویٰ کرتے ہوئے ان چیزوں کے ثبوت کیلئے

مشاہدہ کا مطالبہ کیا جائے پس تینوں قسم کی دلیلوں میں سے یعنی مشاہدہ اور خبر صادق یعنی قرآن و حدیث ثبوت کے لئے موجود ہیں جیسا کہ اوپر شرح بیان ہو چکا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جن اور ملائکہ اور ابلیس کا وجود عقلاً ممکن ہے اور خبر صادق سے ان کا ثبوت ہوتا ہے تو کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ ان کا انکار کیا جائے تمام دنیا کے کام اسی قاعدہ پر چل رہے ہیں کہ جو چیز ممکن الوقوع ہو اس کی سچی خبر ملنے پر اس کو تسلیم کر لیا جاتا ہے مثلاً خبر ملی کہ شاہ جارج پنجم کا انتقال ہوا اور بجائے ان کے شاہ ایڈورڈ ہشتم گدی نشین ہوئے تو چونکہ یہ دونوں باتیں یعنی ایک بادشاہ کا انتقال اور دوسرے کی گدی نشینی ممکن الوقوع ہیں اور خبر کے ذرائع بھی معتبر ہیں مثلاً سرکاری تار اور گورنمنٹ کا اعلان اور اخباروں میں بالعموم شائع ہونا تو کوئی وجہ نہیں کہ اس خبر کو مانا نہ جائے چنانچہ اس وقت کوئی متنفس دنیا میں ایسا نہیں ہے جو اس واقعہ کے ماننے میں شک و شبہ کرے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ جن اور ملائکہ کے وجود میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کیونکہ یہ سب ممکن الوقوع ہیں اور خبر صادق ان کا اثبات کرتی ہے۔

تنبیہ:۔ اگرچہ اس کتاب میں متعدد جگہ ممکن اور محال کی بحث آچکی ہے بنابریں یہاں اس کا دہرانا بےضرورت ہے مگر ہم کیا کریں ہمارے بھائی دین کے لئے دو چار ورق لوٹنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ اور ایک واقعہ بھی ہمارے سامنے اسی بحث کے متعلق پیش آچکا ہے۔ اس وجہ سے بقدر ضرورت اس بحث کو دہرانے

گر بزعم اپنے دلیل کی ضرورت سے اس کو مانا جاتا ہے حالانکہ کوئی دلیل بھی اس پر قائم نہیں چنانچہ اشباہ اول میں اس کی تحقیق بھی ہوئی ہے۔ پس جبکہ ایسے جواہر (فرشتے اور جن ۱۲) کے استحالہ (محال ہونا ۱۲) پر کوئی دلیل عقلی قائم نہیں تو عقلاً ممکن الوجود ہوئے اور جس ممکن عقلی کے وجود پر دلیل نقلی صحیح قائم ہو اس کے وجود کا قائل ہونا واجب ہے (اصول موضوعہ نمبر ۲) اور نصوص میں ان کا وجود وارد ہے اس لئے ایسے جواہر کا قائل ہونا لابد واجب ہوگا۔

یہاں واقعہ یہ ہے کہ حضرت مصنف مدظلہ علی گڑھ میں تشریف فرما تھے احقر بھی ہمرکاب تھا کالج سے ایک پروفیسر صاحب مع چند طلبہ کے تشریف لائے اور حضرت والا سے عرض کیا کہ یہ طلبہ پوچھتے ہیں کہ جن و ملائکہ کے وجود کا ثبوت کیا ہے حضرت والا نے فرمایا کہ ان چیزوں کا وجود عقلاً ممکن ہے اور مخبر صادق نے ان کی خبر دی ہے لہذا ان کے وجود کو ماننا چاہئے جیسا کہ دنیا کی تمام غائب چیزوں کو مانا جاتا ہے اس پر طلبہ مسرور ہوئے اور سب نے متفق اللفظ ہو کر کہا کہ بیشک صحیح ہے لیکن پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ عقلاً ممکن کیسے ہے۔ فرمایا اگر ممکن نہیں ہے تو واجب یا ممتنع (محال) ہوگا۔ کہا ہاں محال ہے حضرت والا نے فرمایا مجھے آپ کی لیاقت معلوم ہوگئی جب آپ ممکن اور محال کو بھی نہیں جانتے تو میرے پاس اتنا دماغ نہیں ہے کہ اول میں ان کی شرح کروں پھر جن اور ملائکہ کو ثابت کروں پس جو اصول کی بات ہے میں نے بتادی۔ اگر آپ کی سمجھ میں نہیں آتا ہے تو اور کسی سے سمجھ لیجئے گا

اس کے بعد حضرت سے انہوں نے پوچھا کہ حضرت نے یہ کیا فرما دیا کہ ان کا وجود ممکن ہے میں نے کہا اگر اس میں آپ کو تامل ہے تو یہ بھی تو فرمایا ہے کہ ان کو بقیہ دو قسموں میں سے کسی میں یعنی واجب یا محال میں داخل کیجئے۔ کہنے لگے محال میں داخل ہے میں نے کہا محال کس کو کہتے ہیں کہنے لگے ناممکن کو میں نے کہا یہ تو محال کا لفظی ترجمہ ہے اس کی ماہیت (حقیقت) بیان کیجئے۔ غرض وہ نہ محال کی تعریف کر سکے نہ ممکن کی مگر یہی کہتے رہے کہ جن اور فرشتوں کا وجود ناممکن ہے۔ اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے مخاطبین ممکن اور ناممکن کی حقیقت بھی نہیں سمجھتے اس واسطے ضرورت ہے کہ ان کی حقیقت بیان کر دی جاتے سمجھ لیجئے کہ کوئی چیز ان تین قسموں سے باہر نہیں ہو سکتی یا اپنی ذات میں واجب الوجود ہوگی یا ممتنع الوجود۔ یا ممکن الوجود۔ واجب الوجود اس کو کہتے ہیں جس کا وجود ہونا دلیل عقلی سے ضروری ہو اور وہ صرف ذات باری عز اسمہ ہے اور ممتنع الوجود اس کو کہتے ہیں جس کا وجود دلیل عقلی سے باطل ہو جیسے اجتماع نقیضین مثلاً کہا جائے کہ ایک چیز موجود بھی ہے اور اسی وقت میں معدوم بھی ہے۔ ممتنع الوجود ہی کو محال اور ناممکن بھی کہتے ہیں۔ اور ممکن الوجود اس کو کہتے ہیں جس کا وجود نہ دلیل عقلی سے ضروری ہو نہ دلیل عقلی سے باطل ہو۔ اس میں تمام چیزیں سوائے ذات باری عز اسمہ کے اور سوائے اس کے جس میں اجتماع نقیضین لازم آتا ہو داخل ہیں۔ بنابریں کوئی

چیز کیسی ہی نئی اور عادت کے خلاف ہو لیکن تا وقتیکہ اجتماع نقیضین کو مستلزم نہ ہو وہ ممکن ہی میں داخل رہے گی اور آج کل کے مدعیان فلسفہ جس کو ناممکن کہتے ہیں اس کی حقیقت مستبعد ہے۔ یعنی وہ چیز کہ اس کے وجود سے بوجہ جدید اور خلاف عادت ہونے کے گونہ تعجب ہوتا ہو اس زمانہ میں کہ جس کو تعلیم اور ترقی کا زمانہ کہا جاتا ہے یہ بات نہایت حیرت کے قابل ہے کہ مستبعد کو ناممکن کہہ دیا جائے حالانکہ دیکھتے ہیں کہ صدہا چیزیں ایسی ایجاد ہو گئیں جن کا کسی وقت میں وہم و گمان بھی نہ تھا۔ جیسے ریل۔ تار برقی۔ ہوائی جہاز۔ وائرلس، ریڈیو وغیرہ اور خبر نہیں آئندہ کیا کیا ایجادیں ہونے والی ہیں اگر ان چیزوں کا ذکر کسی ایسے شخص کے سامنے کیجئے جس نے ان کو دیکھا نہ ہو اور ان کی خبر نہ سنی ہو تو ایک دفعہ تو وہ بے ساختہ ان کو ناممکن ہی کہہ دے گا مگر دیکھنے اور برتنے والوں کی طبیعتوں میں استعجاب بھی باقی نہیں رہا غرض اب سوال کیا جاتا ہے کہ فرشتے اور جن اقسام ثلثہ (واجب اور ممتنع اور ممکن) میں سے کس قسم میں داخل کئے جا سکتے ہیں واجب میں تو باتفاق فریقین داخل نہیں تو اب ممتنع اور ممکن رہ گئے ممتنع میں بھی داخل نہیں ہو سکتے کیونکہ کوئی دلیل عقلی ان کے ابطال پر نہیں قیامت تک کوئی دلیل عقلی ان کے امتناع پر نہیں لائی جا سکتی ہاں ذرا سا استعجاب ہے سو استعجاب کوئی دلیل نہیں جیسا کہ گزرا لامحالہ ممکن میں داخل ہے اور جس ممکن عقلی کا وجود خبر صحیح سے ثابت ہو جائے تو اس کا ماننا ضروری ہوتا ہے (دیکھو

اصول موضوعہ نمبر۲) وہاں اس پہ مفصل بحث ہو چکی اور بدیہی نظیروں سے اس کو ثابت کر دیا گیا ہے - اور سنت صحیح خبریں یعنی قرآن وحدیث کی صاف صاف تصریحات ہم اوپر ملائکہ اور جن کے بارہ میں بقدر ضرورت لکھ آئے ہیں - لہذا عقلاً ونقلاً کوئی گنجائش ان کے انکار کے لیئے باقی نہیں رہی -

اب اس کے متعلق واہی تباہی شبہات نکالنا اور ان شبہات پر ایسا جزم کر لینا کہ ان کے انکار تک کی نوبت آ جائے ایسا ہوگا جیسے شاہ جارج پنجم کے انتقال میں اور اس کے بعد شاہ ایڈورڈ ہشتم کی گدی نشینی میں اس قسم کے شبہات نکالنا کہ کیا شاہ جارج کو طبیب اور دوا نصیب نہ تھے جو مرض سے جانبر نہ ہو سکے اور کیا کوئی اور سوائے ایڈورڈ ہشتم کے گدی کا مستحق نہ تھا جو یہ گدی نشین ہو گئے اور ان مہمل شبہوں کی بنا پر ان کی حکومت سے انکار کر دینا اور بغاوت اختیار کر لینا - جو انجام اس کا ہوگا ظاہر ہے - اسی طرح باوجود قرآن وحدیث کی تصریحات کے ملائکہ کا انکار کرنا اس وعید کا سر لینا اور حق تعالے سے بغاوت اختیار کرنا ہوگا -

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ — یعنی جو شخص دشمن ہو اللہ کا اور اس کے
وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ — فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا اور
فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِينَ — جبریل اور میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے کافروں کا -

منکرین ملائکہ وجن نے ایک یہ طریقہ بھی اختیار کیا ہے کہ صاف انکار نہیں کرتے کیونکہ قرآن وحدیث میں جگہ جگہ ان کا ثبوت آیا ہے بلکہ قرآن وحدیث میں تاویلیں

اور چونکہ اصل نصوص میں حمل علی الظاہر ہے اسی لئے اُس کی تاویلات
بعیدہ کرنا باطل ہوگا اگرچہ دلیل عقلی بھی مرتبۂ ظنیت میں ہوتی (اصول
موضوعہ نمبر ۷) پھر جائیکہ محض وہم غیر معتبر ہی ہو۔

کرتے ہیں اور کھینچ تان کر ان کے ایسے معنے بنا لیتے ہیں جو اپنی مرضی کے موافق ہوں۔ یاد رہے کہ یہ بے اصول بات ہے آیات و احادیث کے ظاہر معنے کو چھوڑ کر دوسرے معنے مراد لینا جائز نہیں حتیٰ کہ جہاں ایسی ضرورت بھی ہو کہ دلیل عقلی اس ظاہر معنے کے خلاف ہو لیکن وہ دلیل عقلی ظنی ہو تب بھی آیت یا حدیث کو ظاہر سے پھیرنا جائز نہیں بلکہ اس وقت میں اس دلیل عقلی ہی کو ظاہر سے پھیر لیا جائے گا کیونکہ اس کے ظنی ہونے کا حاصل یہی ہے کہ اس میں احتمال دوسرے معنے کا بھی ہے۔ جب اس صورت میں بھی آیت یا حدیث میں تصرف جائز نہیں تو ظاہر ہے کہ اُس صورت میں کیسے جائز ہوگا کہ دلیل عقلی بھی نہ ہو بلکہ محض وہم اور شبہ غیر ناشی عن دلیل ہو یہ تو کھلی ہوئی تحریف ہے۔ اس کے لئے ناظرین تکلیف فرما کر اصول موضوعہ نمبر ۷ ضرور دیکھ لیں جس میں تعارض دلیل نقلی و عقلی کی بحث ہے چونکہ اس میں بہت طول ہے اس واسطے ہم یہاں نقل نہیں کرتے۔ مختصر کہنا یہ ہے کہ یہ قاعدہ کہ اصل یہ ہے کہ کلام کے معنے ظاہر پر رکھا جائے صرف نصوص شرعیہ کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر کلام میں مسلم ہے اگر اس کو چھوڑ دیا جائے تو دنیا کے تمام کام درہم برہم ہو جائیں۔ غور کیجئے کہ اگر ایک آقا خدمت گار کو حکم

اور بعض نے علاوہ بنائے مذکور کے کچھ اور شبہات بھی اس میں نکالے ہیں
جو سرسید کی تفسیر میں مذکور ہیں سو البرہان میں اس کا جواب دیکھ لیا جائے۔

دے کہ پان لاؤ اور وہ بجائے پان کے پانی لے آئے اور یہ کہے کہ پان مخفف ہے پانی کا لہذا میں نے یہ سمجھا کہ آپ کا مقصود پانی منگانا ہے اس وقت آپ نے پانی کو مخفف کرکے پان بول دیا ہے لہذا میں نے کوئی غلطی نہیں کی کہ بجائے پان کے پانی لے آیا تو کیا یہ بات قابل سماعت ہوگی۔ یا کوئی عدالت میں اقرار کرے کہ فلاں شخص کے میرے ذمہ سو روپیہ ہیں اور دیتے وقت مٹی کے یا کاغذ کے روپے دے اور کہے کہ میری مراد روپیہ سے یہی روپے تھے تو کیا یہ بات قابل سماعت ہوگی۔ یا ایک شخص پر قتل کا دعویٰ ہوا اور وہ اقرار کرلے کہ ہاں میں نے قتل کیا ہے پھر کہے کہ میری مراد یہ تھی کہ اس شخص کو مجھ سے ایسی محبت تھی جس کو عشق کہہ سکتے ہیں تو میں اس کا معشوق ہوا اور معشوق کی طرف عاشق کے قتل کی نسبت کی ہی جاتی ہے وہ مرا اپنی موت سے ہے مگر میں نے بالمعنے المذکور اس کے قتل کو اپنی طرف منسوب کردیا تھا تو کیا یہ بات قابل سماعت ہوگی۔ ان سب صورتوں میں کیا غلطی ہے سوا اس کے کہ الفاظ کو ظاہر معنے سے پھیرا گیا ہے۔ آج کل جو لوگ نصوص میں تاویلیں کرتے ہیں وہ اسی قسم کی ہوتی ہیں۔ چنانچہ امر زیر بحث میں نصوص کے ظاہر معنے سے تو ثابت ہوتا ہے کہ فرشتے مخلوق مکلف ہیں چڑھتے اترتے ہیں بات چیت کرتے ہیں مگر ہمارے بھائی کہتے ہیں فرشتے قوائے الٰہیہ کا نام ہے یہ

یعنی پان سے مراد پانی لینا اور روپیہ سے مراد مٹی کے روپیہ لینا نہیں تو کیا ہے۔ ذرا تو انصاف کرنا چاہیئے۔ خدا تعالے کے کلام میں اس طرح کی تاویلیں کرنا بڑی جسارت ہے۔

اب ہم بعض شبہات کا حل کرتے ہیں جو فرشتوں کے متعلق کئے جاتے ہیں۔ ایک شبہ یہ ہے کہ فرشتے اگر دنیا میں ہیں اور اس کثرت سے ہیں کہ کوئی جگہ ان سے خالی نہیں تو دکھائی کیوں نہیں دیتے اس کا جواب تحقیقاً والزاماً حضرت مصنف مدظلہ دے چکے ہیں اور ہم بھی اس کی شرح کر چکے اب دفع استبعاد کے لئے اس کی نظیر سنئے۔ کھانے میں سنکھیا یا کوئی اور ایسا زہر ملا دیجئے جس میں کوئی بو اور ذائقہ نہ ہو انسان کو وہ زہر قوت باصرہ سے یا شامہ سے یا ذائقہ سے اور کسی حاسہ سے بھی محسوس نہ ہوگا لیکن بندر اس کو سونگھ کر پہچان لیتا ہے اور نیولا دیکھ کر پہچان لیتا ہے بات یہ ہے کہ حق تعالے نے اس کے پہچاننے کی حس انسان کو نہیں دی ہے اور بندر نیولے کو دی ہے اسی طرح دنیا میں فرشتوں کو دیکھنے کی حس انسان کو نہیں دی ہے مرنے کے بعد اور قیامت میں دی جائے گی تو اس میں کیا استعجاب ہے بلکہ احادیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بعض جانوروں کو یہ حس دی گئی ہے چنانچہ وارد ہے کہ مرغ فرشتے کو دیکھ کر بولتا ہے اور گدھا شیطان کو دیکھ کر بولتا ہے۔ اس میں بھی کوئی تعجب کی بات نہیں بعض جانوروں کو وہ ادراک دیا گیا ہے جو انسان کو نہیں دیا گیا شہد کی مکھی راستہ نہیں بھولتی چیونٹی کو سوراخوں کے اندر کتنی دور سے مٹھائی کا ادراک

ہوتا ہے۔ بندر اندھیرے اجالے میں یکساں دیکھتا ہے علیٰ ہذا چھوٹے سے چھوٹے حشرات الارض اندھیرے میں دیکھتے ہیں۔ یہ باتیں انسان کو حاصل نہیں۔ ایسے ہی اگر دنیا کی زندگی میں حق تعالےٰ نے ایک چیز کی حس انسان کو نہیں دی تو اس سے لازم نہیں آتا کہ وہ چیز دنیا میں موجود نہیں اس کی زندہ نظیر جو حق تعالےٰ نے سائنس والوں ہی کے ہاتھوں میں دے دی ہے وہ ریڈیو ہے جس سے ہزارہا کوس سے امریکہ کی اور فرانس اور جرمنی وغیرہ کی آوازیں سنائی دیتی ہیں اور اس کے موجدین کا خیال ہے کہ آواز ہوا میں تمام دنیا میں پھیل جاتی ہے ہاں اس کے ادراک کیلئے یہ آلہ شرط ہے بلکہ ان کا خیال یہاں تک ہے کہ آواز مدتوں ہوا میں باقی رہتی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ تانسین کے گانے کے بعض جملے اس وقت بھی ملے ہیں اس سے بداہۃً ثابت ہوتا ہے کہ کچھ تعجب کی بات نہیں کہ ایک چیز دنیا میں موجود ہو مگر محسوس نہ ہو۔

دوسرا شبہ یہ ہے کہ فرشتوں کو اجرام لطیفہ فی غایۃ اللطافۃ کہا جاتا ہے لیکن ان کے تصرفات ایسے قوی بتائے جاتے ہیں کہ کسی قوی سے قوی پہلوان سے بھی نہیں ہو سکتے جیسے قوم ثمود پر ایک چیخ مارنا جس سے کلیجے پھٹ گئے۔ قوم لوط کی زمین کو الٹ کر دینا وغیرہ وغیرہ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ خیال غلط ہے کہ ہر لطافت کو کمزوری لازم ہے بلکہ لطافت کو قوت لازم ہے بھاپ کو دیکھئے کہ جب تک پانی تھا اس میں کچھ بھی قوت نہ تھی جب اس میں اجزا ناریہ مل گئے جو پانی

بارہا لطیف ہیں تو اس کی قوت کے کیا کیا کرشمے ہیں جو دنیا کے سامنے ہیں علی ہذا
بارود کو دیکھئے کہ جب تک اس میں آگ نہیں لگی کچھ بھی قوت نہیں اور آگ کے شمول
کے بعد وہ قوت آجاتی ہے کہ کوئی قوت بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی یہ جزو ناری
ہی کا کرشمہ تو ہے جو نہایت لطیف ہے ۔ اور چند روزہ ایجاد بجلی کی قوت کو دیکھئے
کہ اس نے ان سب کو مات کر دیا ہے اس سے لطیف چیز کی قوت کا بھی پتہ
چلتا ہے اور اس کا بھی ثبوت ہوتا ہے کہ ممکن ہے کہ ایک چیز موجود ہو مگر دکھائی نہ دے ۔

تیسرا شبہ یہ ہے کہ فرشتے سب کثیر مخلوق مانی جاتی ہے اور وہ دنیا میں چڑھتے اترتے
چلتے پھرتے ہیں ان میں آپس میں تزاحم کیوں نہیں ہوتا اس کا جواب یہ ہے کہ لطیف چیزوں میں تزاحم
نہ ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں بجلی تار میں چلتی ہے اور انگلی کا کھٹکا تار کے ایک سرے سے دوسرے سرے
تک پہنچتا ہے اس کے لئے کچھ اشارات مقرر کر دیئے گئے جس سے لفظ بن جاتے
ہیں اور خبر ادھر سے ادھر پہنچ جاتی ہے ایک ہی وقت میں دونوں طرف سے
خبر دی جاتی ہے اور بلا اشتباہ و التباس پہنچتی ہے دونوں بجلیوں میں تزاحم
نہیں ہوتا ۔

چوتھا شبہ یہ ہے کہ فرشتے مختلف شکلوں میں کیسے متشکل ہو جاتے ہیں اس
میں دو اشکال ہیں ایک یہ کہ ان کا فی نفسہ بھی کوئی جسم ضرور ہے جس سے وہ چلتے
پھرتے ہیں پھر وہ اگر اپنے اصلی جسم سے چھوٹے جسم میں متشکل ہوئے تو لازم آتا
ہے کہ بہت سے اجزاء جسم اصلی کے الگ ہو گئے یہ اجزاء کہیں دنیا میں پڑے

نہیں ملتے اور اگر بڑے جسم میں متشکل ہوئے تو لازم آتا ہے کہ اور اجزا شامل کرنے پڑے یا اجزا کہاں تیار رکھے رہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ ترکیب و تحلیل آناً فاناً کیسے ہو جاتی ہے۔ اشکال اول کا جواب یہ ہے کہ جیسے لطیف چیز کے اجزاء اصلیہ نظر نہیں آتے ایسے ہی اجزاء منفصلہ و منضمہ بھی نظر نہیں آ سکتے۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے فضا ما بین السماء والارض میں خدا جانے کیا کیا چیزیں موجود ہیں اور کیا کیا ترکیب و تحلیل ہوتی رہتی ہے جن کا آج تک انکشاف نہیں ہوا۔

اور دوسرے اشکال کا جواب یہ ہے کہ ترکیب و تحلیل میں دیر لگنا بھی کثیف اجسام میں ہوتا ہے لطیف اجسام میں نہیں ہوتا دیکھو بارود میں جب تک آگ کا شمول نہیں ہوا اس کی ترکیب و تحلیل میں مثلاً اس کی گولی بنانے میں یا حل کرنے میں کچھ نہ کچھ دیر لگتی لیکن جب اس میں آگ کا شمول ہو جاتا ہے تو آن واحد میں اڑ جاتی ہے اور خود ہی نہیں اڑتی بلکہ گولی اور چھرہ اور گولے اور پتھر اور جو کچھ سامنے ہو سب کو اڑا دیتی ہے۔

پانچواں شبہ: یہ بھی بعض تعلیم یافتہ اصحاب کہا کرتے ہیں کہ مولویوں نے مسلمانوں کو جن بھوت کے قصے بیان کر کر کے ہندوؤں کی طرح توہم پرست بنا دیا ہے بچہ کو ذرا تکلیف ہوئی اور عورتیں کہنے لگیں جھپٹا ہو گیا۔ اس کو پریوں کا سایہ ہو گیا۔ یہ فلاں پیڑ کے نیچے گئی تھی وہاں سے چڑیلوں کا اثر ہو گیا۔ ان کے علاج کے لئے بعض وقت ایمان تک کھو بیٹھتی ہیں۔ کوئی کہتا ہے مجھے جنگل میں ڈنڈ (بے سر کا آدمی)

ملا تھا۔ کوئی کہتا ہے سنبھل کے درخت پر نٹ رہتا ہے۔ غرض عجیب بے سر پا خیالات پیدا ہو گئے ہیں اور یہ سب نتیجہ بے دیکھی چیزوں کے منوانے کا ہے۔ ہم کہتے ہیں جب ایک چیز کسی معتبر ذریعہ سے (مشاہدہ سے یا استدلال عقلی سے یا خبر صادق سے) ثابت ہو جائے تو اس کا انکار کسی مفسدہ کے لزوم سے نہیں کیا جا سکتا اس کی موجودہ نظیر وجود جراثیم ہے جو تعلیم یافتہ طبقہ کے نزدیک مسلم ہے جس کو نہ ہر شخص نے مشاہدہ کیا ہے۔ نہ ہر شخص کے لئے استدلال عقلی سے ثابت ہے صرف خبر صادق سے ثابت ہے یعنی سائنس والوں کے کہنے سے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہزارہا قسم کے جراثیم پانی اور ہوا میں اور حیوانات اور انسانوں کے جسم میں موجود ہیں یا پیدا ہو جاتے ہیں کسی سے ہیضہ پیدا ہوتا ہے کسی سے طاعون کسی سے ملیریا بخار وغیرہ۔ ان کے اثر سے بچنے کے لئے مچھر دانیوں میں سونا اور بیٹھنا چاہیئے۔ اور فنائل گھروں میں اور راستوں میں چھڑکنا چاہیئے اور مکھی مچھر سے بچنے کے لئے کھانے پینے کی چیزوں کو گلاس کیسوں میں رکھنا چاہیئے مکان میں کھڑکیاں ایسی جالی کی ہونی چاہئیں جس میں مکھی مچھر نہ جا سکے کیونکہ وہ جراثیم ان کی پیٹ میں ہوتے ہیں اور اس سے جسم میں پہنچ جاتے ہیں بلکہ گرد و غبار میں طرح طرح کے جراثیم ہوتے ہیں۔ ہر روز راستوں میں پانی چھڑکنا چاہیئے تاکہ غبار نہ اڑے۔

دیکھئے جراثیم کے وجود کو مان لینے سے کتنے بکھیڑے سر پڑ گئے۔ جو بچانے خود

مفاسد ہیں مگر ان مفاسد سے بچنے کے لئے کیا کوئی تعلیم یافتہ صاحب اس کیلئے آمادہ ہیں کہ ان جراثیم کے وجود کو تسلیم ہی نہ کیا جائے تاکہ یہ بکھیڑے نہ کرنے پڑیں۔ ہرگز نہیں، بلکہ اہل سائنس کی داد دیتے ہیں کہ کیسے کیسے آلات ایجاد کئے ہیں اور کیسے کیسے تجربے کرتے ہیں جن کا پہلے خیال بھی نہ تھا۔ اور بڑے سے بڑے فلاسفروں کا ذہن بھی وہاں تک نہ پہنچا تھا اور حتی الامکان جراثیم سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جراثیم کا ثبوت سب کے واسطے مشاہدہ سے نہیں ہے بلکہ زیادہ تر خبر صادق سے ہے جس کو کسی بکھیڑے کی وجہ سے چھوڑا نہیں جاتا۔ اس سے ہمارا مدعا ثابت ہوگیا کہ ثابت شدہ چیز کو کسی مفسدہ کے لازم آجانے سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا شیاطین اور جن کے وجود سے خبر صادق موجود ہونے کے بعد بعض خرابیاں پیدا ہونے کی وجہ سے (مثلاً توہم پرستی وغیرہ) انکار نہیں کیا جا سکتا پھر ہم کہتے ہیں کہ جو توہم پرستی جن بھوت کے تصور پر لازم کی گئی ہے وہ نتیجہ ان کے ماننے کا نہیں ہے بلکہ وہ نتیجہ افراط وتفریط کا ہے جو جہالت سے اور علماء کی صحبت نہ پانے اور جہلاء کی صحبت پانے سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ صحابہ و تابعین و علماء سلف سب ملائکہ اور جن و شیاطین کے قائل تھے لیکن ان توہم پرستیوں میں مبتلا نہ تھے۔ اور اس وقت بھی سوا ہندوستان کے کسی ملک کے مسلمان اس میں مبتلا نہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر یہ اثر بے علمی اور ہندوؤں کی صحبت کا ہے۔ غرض توہم پرستی علماء کی تعلیم سے نہیں پیدا ہوئی بلکہ علماء کی صحبت نہ پانے سے پیدا ہوئی تو اس سے جن و ملائکہ کے

ثبوت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

چھٹا شبہ۔ اگر جن کا وجود ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ ان کے افعال واثرات ہندوستان میں ہی محسوس ہوتے ہیں۔ دوسرے ممالک میں خصوصاً یورپ میں کہیں محسوس نہیں ہوتے۔ کسی انگریز کو نہیں سنا کہ جن لپٹ گیا ہو۔

یہ سوال ایک مجمع میں خود حضرت مصنف مدظلہ سے کیا گیا۔ ارشاد فرمایا جو شخص کسی چیز کا منکر ہوتا ہے اس میں ایک قسم کی قوت دافعہ پیدا ہو جاتی ہے جو اس چیز کے اثر کو قبول کرنے سے مانع ہوتی ہے۔ چونکہ اہل یورپ جن کے منکر ہیں اس وجہ سے ان پر اثر نہیں ہوتا۔ اس سے جن کی واقعیت پر اثر نہیں پڑتا چونکہ نصوص شرعیہ سے جن کا ثبوت ہوتا ہے۔ اس وجہ سے قائل ہونا ضروری ہے۔ ہمارے قائل ہونے کی بنا احساس اثر نہیں ہے بلکہ ورود نصوص ہے۔ احقر اس کی تصدیق کے لئے یہ نظیر پیش کرتا ہے کہ بعض غذائیں اور دوائیں دیہات میں استعمال کی جاتی ہیں اور وہ از روئے طب و ڈاکٹری مضر ہوتی ہیں حتیٰ کہ بعض زہریلی ہوتی ہیں مگر دیہاتیوں کو نقصان نہیں کرتیں بعض قومیں چوہا چھپکلی۔ سانپ تک کھا جاتی ہیں مگر ان کو کچھ نقصان نہیں ہوتا بلکہ وہ شہریوں سے زیادہ توانا تندرست ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ وہی ہے جو حضرت مصنف مدظلہ نے ارشاد فرمائی لیکن اس سے یہ نتیجہ کوئی نہیں نکالتا کہ ان چیزوں میں مضرت نہیں اور طبی و ڈاکٹری تحقیق غلط ہے اور شہریت چھوڑ کر دیہاتیت اختیار کرنا چاہیئے اور یہ بھی واضح رہے کہ اب یورپ میں بھی

جن کے ثبوت کی طرف خیالات پیدا ہو چلے ہیں۔ اور اثرات بھی محسوس ہونے لگے ہیں۔ چنانچہ عنقریب آگے آتا ہے ۔

اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جن و ملائکہ کے ثبوت میں علاوہ نقلی دلائل کے کچھ عقلی استبعاد بھی نہیں بلکہ عقل سلیم ان کے وجود کو تسلیم کرتی ہے۔ دیکھئے ایک زمانہ وہ تھا کہ امراض پیدا ہونے کیلئے اخلاط اربعہ یعنی خون، بلغم، سودا۔ صفرا کے تغیرات کو موثر مانا جاتا تھا۔ تمام طب قدیم کی بنیاد اسی پر تھی اور ہزاروں برس اسی پر یقین کیا گیا۔ لیکن زمانۂ حال کے سائنس دانوں کو بذریعۂ جدید آلات کے منکشف ہوا کہ یہ اثر بے جان مادہ کا نہیں ہے بلکہ ایک جاندار زندہ مخلوق کا ہے جس کو جراثیم کہتے ہیں چنانچہ ہر مرض کے جراثیم خوردبینوں سے علیحدہ علیحدہ پائے جاتے ہیں۔ آج کل یہ تحقیق اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ جراثیم کو معائنہ کرنے کے آلات اور ان کو زندہ رکھنے اور پرورش کرنے کیلئے ان کی غذائیں اور ان کو مارنے کے لئے دوائیں سب مہیا ہو گئی ہیں۔ تندرست آدمی کے بدن میں جس قسم کے جراثیم پہنچا دیئے جائیں اسی قسم کا مرض پیدا ہو سکتا ہے اور مریض کے جسم میں ان کے مارنے والی دوا پہنچا دی جائے تو مرض جاتا رہتا ہے۔ غرض علم جراثیم ایک مکمل علم اس وقت موجود ہے اور طب جدید کا ایک مستقل شعبہ ہے۔ اب ہم تعلیم جدید کے دلدادہ اصحاب سے پوچھتے ہیں کہ ایک طرف پرانی تحقیق کو دیکھئے کہ امراض اخلاط سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور ایک طرف نئی تحقیق کو دیکھئے کہ امراض جراثیم سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان دونوں میں کونسی

تحقیق کو آپکا دل قبول کرتا ہے ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ نئی تحقیق کو قبول کریگا چنانچہ ہم نے اپنے کانوں سے یہ کہتے سنا ہے کہ پرانے اطبا کے پاس آج کل کے سے آلات نہ تھے اس واسطے انھوں نے اثر کو مادہ کی طرف منسوب کر دیا اور نئے اطبا کے پاس جدید آلات ہیں جن سے بال کی بھی کھال نکل آتی ہے۔ وہ اس تحقیق پر کفایت نہیں کر سکتے۔ ان کو ہر مرض کے لئے ایک جاندار مخلوق نظر آتی ہے وہ اثر کو اس کی طرف منسوب کرتے ہیں (اس مخلوق کو جراثیم کہتے ہیں) اس کی شہادت اس سے ملتی ہے کہ جراثیم بدن میں داخل کرنے سے مرض پیدا ہو جاتا ہے اور ان کو فنا کر دینے سے مرض جاتا رہتا ہے۔

اسی طرح ایک طرف اس خیال کو رکھئے کہ دنیا میں جو کچھ پیدا ہوتا ہے یعنی خود

لہ ہم اس تحقیق قدیم و جدید کے موازنہ میں یہاں اس واسطے طول نہیں دیتے کہ یہ کوئی کتاب طبی نہیں ہے۔ لہٰذا صرف اس پر اکتفا کرتے ہیں کہ جراثیم پیدا ہونے سے پہلے بھی تو ماننا پڑے گا کہ ان کا کوئی مادہ ہوتا ہے جس میں صورت پیدا ہوتی ہے اور رجحان پڑھیانی ہے۔ یہ مادہ تندرست آدمی میں نہیں تھا۔ مرض کے وقت پیدا ہوا یہ مادہ سوا اس کے اخلاط کے تغیر سے پیدا ہوا اور کہاں سے بدن میں آگیا۔ نیز جراثیم سے مرض پیدا ہونے کی حقیقت سوا اس کے کیا ہے کہ ان کے اجسام میں سے نکلے ہوئے بخارات جو ارواح انسانی سے بالکل اجنبی ہیں اعضاء رئیسہ انسانی میں پہنچتے ہیں اور ان کے مزاج کو بگاڑ دیتے ہیں۔ تو پھر بنا مرض کی تغیر اخلاط و ارواح ہی پر رہی۔ بنا بریں کہا جا سکتا ہے کہ علت مادی مرض کی اخلاط فاسدہ ہیں ان ہی سے جراثیم پیدا ہوتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی نظر صرف جراثیم تک پہنچتی ہے۔ اور اطبا کی نظر جراثیم کی بھی اصل تک پہنچتی ہے۔ ڈاکٹروں کی نظر محقق ہوئی غور کرنے کی بات ہے۔ لیکن ہم کو یہاں صاف کر دینا رہیں ہمارا مدعا ثابت ہونے کے لئے مقابل کا اس نظریہ کو تسلیم کرنا کہ بہ نسبت قابلیت اخلاط کے فاعلیت جراثیم صحیح ہے ہم کو کافی ہے

موالید ثلاثہ یعنی جمادات، نباتات، حیوانات کا وجود اور ان کے طرح طرح کے
تغیرات جو ظہور میں آتے ہیں یہ آپ سے آپ ہو جاتے ہیں یا مادہ کے طبعی اقتضا سے
ہوتے ہیں۔ اور ایک طرف اس تحقیق کو رکھئے کہ یہ سب تغیرات کسی جاندار بلکہ سمجھ دار مخلوق
کے ذریعہ سے ہوتے ہیں۔ جو ہم کو نظر نہیں آتی۔ انصاف سے کہئے کہ کون سی بات
دل کو لگتی ہے۔ اگر استبعاد سے مرعوب نہ ہو کر اپنے ضمیر میں آپ غور کریں گے تو
تحقیق ثانی ہی کو تسلیم کریں گے بس شریعت اسلامی یہی کہتی ہے کہ عالم میں جتنے تغیرات
ہوتے ہیں ان کی علت فاعلی مادہ نہیں ہے بلکہ مادہ علت مادی ہے اور علت
فاعلی ایک اور مخلوق ہے جو ذی روح اور ذی عقل و فہم ہے۔ اسی کو ملائکہ (فرشتے)
کہتے ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ آپ سے آپ ہو جانا تو بداہتہً باطل ہے کیونکہ فعل کے لئے
فاعل کا ضروری ہونا ایسی بدیہی بات ہے کہ انسان تو انسان جانور بھی اس
کو مانتے ہیں کسی جانور کو پیچھے سے مارا جائے یا دور سے ڈھیلا پھینک کر مار دیا
جائے تو وہ فوراً چاروں طرف دیکھے گا کہ کس نے مارا اور اس پر ہرگز قناعت نہ
کرے گا کہ آپ سے آپ ڈھیلا لگ گیا ہو گا۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے
کہ ہر جاندار کی فطرت میں یہ بات پڑی ہوئی ہے کہ فعل بلا فاعل نہیں ہو سکتا۔
غرض یہ کہ تغیرات عالم کا آپ سے آپ ہو جانا تو بداہتہً باطل ہے۔ رہا مادہ
کے طبعی اقتضا سے ہونا سو حاصل اس کا بھی وہی آپ سے آپ ہو جانا ہے کیونکہ
یہ بھی مسلم ہے کہ مادہ غیر ذی حس اور غیر ذی شعور ہے۔ تو اس کی طرف ایسے افعال

کو منسوب کرنا جن کے کرنے سے بلکہ سمجھنے سے بھی بڑے بڑے ذی جبلۃ و ذی شعور عاجز ہیں۔ ایسا ہوگا جیسے کوئی ایک بڑے کارخانے کو دیکھ کر جس میں ہزارہا مشینیں لگی ہوئی ہیں اور کام کر رہی ہیں۔ یوں کہنے لگے کہ یہ تمام کارخانہ کسی کاریگر نے نہیں بنایا اور نہیں چلایا بلکہ ایک مٹی کے ڈھیلے نے بنایا ہے۔ اور وہی چلا رہا ہے۔ جیسے یہ کہنا بداہتًہ باطل ہے۔ ایسے ہی یہ کہنا کہ مادہ کے طبعی اقتضا سے تغیرات عالم ہو رہے ہیں۔ باطل ہے۔ اور اس کہتے ہیں اور اس کہتے ہیں کہ اتنے بڑے کارخانے کو ایک مٹی کے ڈھیلے نے بنایا اور وہی چلا رہا ہے۔ سوائے الفاظ کی بندش کے کچھ فرق نہیں۔ بمقابلہ اس کے یہ تحقیق بالکل قابل قبول ہے کہ نہ تغیرات عالم از خود ہوتے ہیں نہ مادہ کے طبعی اقتضا سے ہوتے ہیں بلکہ ایک خفیہ مخلوق کے فعل سے ہوتے ہیں جو ذی جبلۃ اور ذی شعور ہے (اسی کو ملائکہ کہتے ہیں) اسی پر جن کو قیاس کر لیا جا سکتا ہے۔ جیسے ملائکہ خفیہ مخلوق ہے ایسے ہی جن بھی ہے۔

تمت